ISSN 0974-7346

دسمبر ۲۰۲۵ء

جلد۲۱۲ــــــعدد ۱۲

معارف

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان میں	:	سالانہ ۴۰۰؍روپے۔ فی شمارہ ۴۰؍روپے اسپیڈ پوسٹ ۱۰۰۰؍روپے
		ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۸۰۰؍روپے میں دستیاب ہے۔
		ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰؍روپے ہے۔

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ای میل (ساری دنیا میں) ۴۰۰؍روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کر کے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC : PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

● زر تعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔ ● معارف کا زر تعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔ ● خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ ● معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ ● کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے تصنیفی اور نشریاتی کام میں مدد کے لیے اس اکاؤنٹ پر تعاون کریں:

بینک کا نام: Punjab National Bank

اکاؤنٹ نمبر: 4761005500000051

آئی ایف ایس سی: PUNB0476100

تعاون بھیجنے کے بعد تفصیلات سے ہم کو اس ایمیل پر مطلع کریں:

info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی CSR کے تحت رجسٹرڈ ہے۔اب بڑی تجارتی کمپنیاں براہ راست دارالمصنّفین کو CSR کے تحت عطیات دے سکتی ہیں۔

نوٹ: غیر ممالک سے تعاون بھیجنے کے لیے بینک کی تفصیلات ایمیل بھیج کر حاصل کریں۔

Ma'arif Section: 06386324437

Email: info@shibliacademy.org website: www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

| جلد نمبر ۲۱۲ | ماہ جمادی الاخریٰ ۱۴۴۷ھ مطابق ماہ دسمبر ۲۰۲۵ء | عدد ۱۲ |

مجلس ادارت

پروفیسر شریف حسین قاسمی
دہلی

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی
علی گڑھ

ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی
دہلی

مرتبہ

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان
محمد عمیر الصدیق ندوی
کلیم صفات اصلاحی

ادارتی سیکریٹری:
ڈاکٹر کمال اختر

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات	محمد عمیر الصدیق ندوی	۴
مقالات		
خلیق احمد نظامی کی تحقیقی خدمات	ناصر احمد گنائی	۷
فکر اقبال کا انقلابی پہلو	ڈاکٹر محمد ارشد	۱۷
فارسی زبان میں تاریخ نویسی: ہندوستانی مسلم مؤرخین کے حوالے سے	محمد ممتاز عالم	۳۲
ٹیپو کا معاشرتی انصاف اور باہمی اتحاد کی پالیسی	کلیم صفات اصلاحی	۴۱
علامہ فراہی کی فارسی شاعری	ڈاکٹر ابوذر ندوی	۵۵
باب التقریظ والانتقاد		
”بیان شبلی“	کلیم صفات اصلاحی	۶۸
تبصرۂ کتب		
	ک۔ ص۔ اصلاحی	۷۴
ادبیات		
نعت پاک	وارث ریاضی	۷۸
استدراک	انیس احمد/ ظفر الاسلام خان	۷۹
معارف کی ڈاک	طلحہ نعمت ندوی	۸۱
رسید کتب موصولہ		۸۲

شذرات

ضروری تو نہیں لیکن عام طور پر مطمئن اور مسرور گھروں، معاشروں اور قوموں پر نظر کی جاتی ہے تو ان کے ہاں شور و غل، چیخ پکار اور بلند آہنگ بحث و مباحثہ کی جگہ کم سخنی، لہجہ کی نرمی یا پھر پر وقار خاموشی کا عالم زیادہ نظر آتا ہے۔ قوموں کے ساتھ ملکوں کی ترقی، خوش حالی اور فارغ البالی میں بھی اسی قسم کی خوبیاں زبان پر آجاتی ہیں۔ ساتھ ہی یہ احساس بھی دلا جاتی ہیں کہ اگر کوئی قوم یا ملک ان خوبیوں سے خالی ہے یا اس کے برعکس اس کے عوام و خواص زیادہ بولنے والے اور لہجوں کے آہنگ میں زور و شدت کا اظہار کرنے والے اور ملک و قوم کو درپیش مسائل حتی کہ مصائب کے تعلق سے بھی بسیار گوئی میں مبتلا ہیں تو دور سے دیکھنے والوں کے لیے زود گوئی کے ہرزہ سرائی میں بدل جانے کے منظر بھی حیرت و استعجاب کا سبب نہیں بنتے۔

***

ملک عزیز میں ادھر چند برسوں سے حکومت کی ذمہ داری سنبھالنے والوں نے ذمہ داری سونپنے والوں کو جس طرح سخت کلامی اور ہذیانی کیفیت کا عادی بنانے کی دانستہ کوششیں کی ہیں، اس کا اثر صرف نغمہ شادی ہی نہیں نوحۂ غم کے موقعوں پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ جشن ہو، تہوار ہو، ولادت یا وفات کی تاریخیں ہوں، عبادت اور مذہبی مراسم کی وقار طلب تقریبات ہوں یا پھر انتخاب جیسے سنجیدہ ترین موقع پر فہم و تدبر کی آزمائش ہو، جس میں حال سے زیادہ مستقبل پر نظر رکھنے کی صبر آزما مشق و مشورہ کی فکر انگیز ساعتیں ہوں، وہاں ایک عالم، طوفانِ بے تمیزی کی تصویر بن کر شورِ شر انگیزی ہی کو زندگی سمجھ بیٹھتا ہے۔ یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ مادی لحاظ سے خوش حال قوموں اور ملکوں کی پہچان یہی ہے کہ ہر روز روز عید ہو اور ہر شب شب برات۔ لیکن جس ملک میں غریبی، گرانی، بے روزگاری کی کوئی حد نہ ہو، جہاں ملک کی نصف سے زیادہ آبادی کی بھوک، امدادی اور خیراتی غذا کی فراہمی پر منحصر ہو، جہاں تعلیم اور صحت جیسی بنیادی انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے میں مجرمانہ حد تک تغافل کی صورت ہو، جہاں وسائل حمل و نقل کی بدترین شکلوں کی کثرت ہو، جہاں بیماروں اور بیماریوں کی شرح دنیا کے ہر ملک سے زیادہ ہو۔ جہاں عالمی رودادوں، تبصروں اور جدولوں میں ملک عزیز مسلسل پستیوں میں گرتا دکھائی دیتا ہو، جس کو شہری امور میں، حوصلہ شکنی کرنے والے ملکوں میں شامل کیا گیا ہو، یعنی اس طبقہ میں شامل کیا جاتا ہو جہاں شہری امور میں ملنے والی آزادی کو محدود کیا جاتا ہے اور جہاں قانونی اور عملی رکاوٹیں پیدا کر کے شہریوں کو ان کے بنیادی حقوق کے کامل استعمال کا موقع نہیں دیا جاتا یا حیلے بہانے سے کام لیا جاتا ہے۔ ایسا ملک عزیز ایک طرف تو تشہیر کے شور و غل سے ایک نقار خانے میں بدلتا جاتا ہے۔ دوسری

طرف یہ عالمی سچائیاں ہیں کہ "ہندوستان اپنے دستیاب وسائل کے باوجود اپنے خطے میں توقع سے بھی کم اثرورسوخ رکھتاہے"۔ قانون کی حکمرانی، سیاسی تعددیت، انتخابات، امور حکومت، شہری آزادی کے لحاظ سے ۲۰۱۴ء میں ہندوستان کو ۷۷واں مقام حاصل تھااور اسی وجہ سے اس کی درجہ بندی آزاد ملک کی تھی۔ اب صرف دس سال میں یہ گرکر ۶۴ویں مقام پر آگیااور مکمل آزادی کی جگہ اب اسے جزوی آزادی کے طبقے میں شامل کردیا گیا۔ ایک بڑے مبصر اور تجزیہ نگار نے بین الاقوامی تبصروں اور جدولوں کو اس نظر سے دیکھا کہ عالمی پیمانے پر ہمارا ملک عزیز ترقی اور خوش حالی اور سکون و آزادی کے کس مقام پر ہے تو جی ڈی پی ہو یاعالمی مسرت کاپیمانہ ہو، سماجی مدد اور صحت مند زندگی کی توقع، یااسلوب حیات کے انتخاب کی آزادی ہو، سخاوت ہو یاپھر بدعنوانی کے معاملات اور عوام کی پریشانی کے حالات ہوں، ملک ان تمام امور میں پستی کی نئی گہرائیوں میں مزید گرتا جاتاہے۔ صحافتی آزادی میں دس سال میں وہ ۱۴۰ویں مقام سے گرکر ۱۵۱ویں مقام پر آگیا۔ یہ اور اس قسم کی تمام عالمی جدولیں، ملک کی حقیقی صورت حال کو سامنے لاتی جارہی ہیں، مگر ملک میں جس طوفان بے تمیزی کے حالات بنائے گئے اور ہرکس وناکس بھیڑ کا حصہ بن کر مقدور بھر آوازے کسنے کو جس طرح قوم پرستی اور وطنی مفاد کے اظہار کا ذریعہ سمجھتاہے اور سمجھانے میں مصروف ہے، اس کا نتیجہ کیا خوش حالی، فارغ البالی اور ایک مہذب و متمدن قومی شعور کی صورت میں ممکن ہے؟ اس سوال کا جواب اکثریت دے نہ دے لیکن اقلیت کو اس کے مثبت جواب دینے کے لیے اپنی راہ اور رویہ دونوں کو راستی کے رنگ میں رنگنا ہوگا۔

***

یہ احساسات صرف موجودہ حالات کا نتیجہ نہیں ہیں۔ ستّر سال پہلے جب یہ عالمی تبصرے، جائزے اور جدولیں اتنی متحرک نہیں تھیں، اس وقت معارف نے جو کہا تھا، اس کو آج کے تناظر میں مذہبی اصطلاحوں کی مدد سے دوربینی اور عاقبت اندیشی کی جگہ کشف و کرامات سے تعبیر کیا جاسکتاہے۔ شاہ معین الدین احمد ندوی آج کے اصطلاحی صحافی بھی نہیں تھے، ہاں قلندرانہ شان لیے ہوئے مرد درویش ضرور تھے، اس لیے جو کہتے گویا نظروں کے سامنے رکھ کر کہتے۔ انہوں نے مصلحت کے حجابوں سے نہیں صاف لفظوں میں ۱۹۶۲ء میں لکھا تھا کہ ہندوستانی مسلمان جن حالات میں مبتلا ہیں اس کی ذمہ داری سے وہ خود بھی بری نہیں ہیں۔ وہ حکومت اور اکثریت کی شکایت تو برابر کرتے ہیں لیکن اپنی خامیوں پر ان کی نظر نہیں جاتی۔ شاہ صاحب نے کیا قلندرانہ بات کہی کہ مسلمانوں کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ ان کا کوئی ایسا نصب العین نہیں، جس کے لیے وہ ایک مرکز پر جمع ہوسکیں، اس لیے ان کی ساری قوتیں منتشر ہیں۔ عام مسلمانوں میں قومی زبوں حالی کا احساس تک نہیں، اگر ان کو پیٹ بھر روٹی ملتی رہے تو وہ اس پر قانع ہیں، کوئی لیڈرشپ

نہیں جو ان میں قومی احساس پیدا کرسکے۔ محدود و مختصر تعلیم یافتہ باشعور طبقہ میں کچھ احساس ہے بھی تو وہ عمل کے میدان میں عوام سے بلند نہیں۔ خواص کا طبقہ جس میں قیادت کی صلاحیت ہو اور وہ عام مسلمانوں اور حکومت پر اثر انداز ہوسکے، بہت کم ہے اور جس قدر ہے، حد درجہ ناقص اور خود غرض ہے۔ اس کو اپنے فائدے سے کام ہے۔ اگر مسلمانوں کے لیے علاحدہ تنظیم کی گنجائش نہیں تو کم سے کم وہ ترقی پسند پارٹیوں میں جماعتی حیثیت سے شریک ہو کر موثر پوزیشن حاصل کرسکتے ہیں۔ لیکن انتشار و پراگندگی کی وجہ سے یہ بھی نہیں ہے۔ اسی لیے کسی پارٹی میں بھی ان کی کوئی موثر پوزیشن نہیں ہے، ان کی کوئی آواز بھی نہیں۔ اللہ اکبر! ستر سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا، اتنا عرصہ کسی بھی قوم یا طبقہ کے استحکام یا احیاء کے لیے کم نہیں، مگر وقت کا ہر گزرتا لمحہ جیسے صرف یہی ظاہر کرتا جاتا ہے کہ جاگنے، جاگتے رہنے کی چاہت ہی ان نیند کے ماتوں کے دل و دماغ سے نکل چکی ہے۔ جب یہ بنیادی باتیں ہی جوں بن کر کانوں پر نہیں رینگیں تو آگے کون کہتا کہ مسلمانوں کی دوسری خامی یا غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے ہندوستان میں اس تبلیغ کا فریضہ ہی انجام نہیں دیا جو برادران وطن کے سامنے صحیح اسلامی تعلیمات اور اسلامی اخلاق سے عبارت تھا۔ یہ کام کیا گیا ہوتا تو شاید آج ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی، وہ دوری کبھی نہ ہوتی جو اب ایک دوسرے سے نفرت میں بدلتی جارہی ہے۔ سچائیوں کی اپنی دنیا ہے۔ اس دنیا سے منھ پھیر کر کامیابی کی راہوں کو تلاش کرنا، بہرحال عقل و حکمت کی بات نہیں۔

***

گذشتہ ماہ کے شذرات لکھے جاچکے تھے کہ علی گڑھ سے جناب پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی نے یہ افسوس ناک خبر دی کہ یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے سابق صدر پروفیسر عبدالباری نے اس دنیائے فانی کو الوداع کہہ دیا، وہ اکیڈمک کونسل کے بھی صدر، ہسٹری کانگریس اور کئی اور اہم شعبوں کے رکن رہے۔ صدر جمہوریہ ایوارڈ سے بھی سرفراز ہوئے تھے۔ شعبہ عربی کی ترقی میں ان کی کوششوں کا بڑا دخل رہا۔ ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹/ اکتوبر ۲۰۲۵ء میں وفات پائی۔ اس طرح قریب اکیانوے سال کی عمر پائی، عمر کی درازی، اعمال صالحہ میں اضافہ کا سبب بننے سے مبارک باد کے لائق بن جاتی ہے۔ عبدالباری صاحب کی تعلیمی و تدریسی خوبیوں میں ان کی نیکیوں اور ان کے حسن اخلاق کا حصہ بہت زیادہ رہا، اسی لیے عام محبوبیت ان کو حاصل ہوئی۔ جس وقت دل کا دورہ پڑا اس سے کچھ پہلے تک وہ بیمار تو نہیں تھے، مغرب کی نماز کے لیے وضو کیا، مصلی پر گئے اور پھر اپنے رب کے حضور آخری سجدہ کی حالت میں حاضر ہوگئے۔ کیا قابلِ رشک، وقتِ رخصت پایا۔ یقین ہے کہ وہ اعلیٰ علیین کے مستحق ہوں گے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ۔

***

خلیق احمد نظامی کی تحقیقی خدمات

ناصر احمد گنائی
شعبۂ اسلامیات، اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، اونتی پورہ، کشمیر
nasirehmad44@gmail.com

خلیق احمد نظامیؒ کا تعلق ایسے عہد سے تھا جب علی گڑھ کا علمی ماحول صرف تعلیمی سرگرمیوں تک محدود نہ تھا بلکہ وہاں کے در و دیوار سے تہذیبی وقار، فکری دیانت اور روحانی لطافت جھلکتی تھی۔ وہ صرف ایک ادارے کے طالب علم نہیں تھے بلکہ ایک روایت کے امین بھی تھے۔ ایک ایسی روایت جو سر سید سے ہوتی ہوئی شبلی، حبیب الرحمن خاں شروانی، سلیمان ندوی اور رشید احمد صدیقی جیسے افراد کے قافلے سے گزرتی رہی۔

نظامی صاحب کی پیدائش ۵ دسمبر ۱۹۲۵ء کو امروہہ کے ایک علمی خانوادے میں ہوئی۔ ان کے والد مولوی امیر احمد خاں، دینی شعور اور علمی شوق کے حامل فرد تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر اور مقامی مدارس میں حاصل کی۔ بعد ازاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا رخ کیا، جہاں سے ۱۹۴۵ء میں بی-اے اور پھر ۱۹۴۷ء میں ایم-اے (تاریخ) مکمل کیا جس کے بعد وہ وہیں تدریس سے منسلک ہو گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب علی گڑھ کی علمی فضا صرف تعلیمی سند حاصل کرنے کی جگہ نہیں تھی بلکہ فکر، تہذیب، اور سچائی کی تلاش کی ایک مسلسل تحریک تھی۔ نظامی صاحب کو وہاں مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، ڈاکٹر زرین احمد فاروقی اور پروفیسر محمد حبیب جیسے اساتذہ کی قربت نصیب ہوئی۔ محمد حبیب کا تصوف اور تاریخ کے درمیان ربط پر زور، نظامی صاحب کے مزاج کے ساتھ گہری مطابقت رکھتا تھا۔ انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ ان کی فکری ساخت میں محمد حبیب کی اثر پذیری بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

نظامی صاحب صرف کتابی طالب علم نہ تھے۔ ان کی طبیعت میں ایک غیر معمولی ٹھہراؤ، مشاہدے کی گہرائی، اور سوال کرنے کی صلاحیت پائی جاتی تھی۔ وہ ہر موضوع کو فقط معلومات کی سطح پر نہیں دیکھتے تھے، بلکہ اس کے فکری، تہذیبی اور روحانی پہلوؤں کا ادراک بھی رکھتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ جب وہ دہلی سلطنت یا مغلیہ دور پر تحقیق کرتے ہیں تو صرف بادشاہوں کی جنگی فتوحات یا نظامِ سلطنت پر نہیں رکتے، بلکہ وہ اس معاشرت کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتے جس میں صوفیاء، علماء، عوام، ہنر منداور دانشور سانس لیتے تھے۔

ان کی علمی تشکیل میں صرف علی گڑھ کا کردار نہیں، بلکہ وہ صوفیانہ فضا بھی شامل تھی جس میں وہ جوان ہوئے۔ امروہہ کا صوفی منش ماحول، اولیائے کرام سے قلبی نسبت اور اسلامی روحانیات سے قلبی لگاؤ۔ ان عوامل نے انہیں ایک ایسے مؤرخ میں تبدیل کیا جس کے اندر ایک خاموش، متفکر، دردمند درویش بھی چھپا ہوا تھا۔

ان کے شاگردوں اور ہمعصروں کا بیان ہے کہ وہ علم میں وسعت کے ساتھ ساتھ کردار میں بھی گہرائی رکھتے تھے۔ سادگی، بردباری، اور نرم گفتاری ان کی شخصیت کے بنیادی اوصاف تھے۔ وہ طالب علموں کو محض "تعلیم" نہیں دیتے تھے بلکہ ان کی "تربیت" بھی کرتے تھے اور یہی تربیت ان کی تحریروں سے بھی جھلکتی ہے۔

خلیق احمد نظامی کی شخصیت اور ان کے فکری سفر کو صرف تعلیمی اسناد یا عہدوں کی فہرست سے نہیں سمجھا جا سکتا؛ اس کے لیے ان کے اسلوب، موضوعات کے انتخاب، حوالہ جات کی سچائی، اور علمی دیانت کی روشنی میں دیکھنا ہوگا، تب جا کر ہم جان سکیں گے کہ یہ شخصیت اپنے عہد کا صرف مورخ نہیں، بلکہ اس عہد کا ایک "صوفیانہ مورخ" تھا۔

تاریخی تحقیق میں خلیق احمد نظامی کی خدمات: خلیق احمد نظامی کی تاریخ نویسی میں سب سے پہلی چیز جو قاری کو متأثر کرتی ہے وہ ان کا اسلوبِ بیان اور تحقیقی دیانت ہے۔ ان کی تحریر میں نہ کوئی لفاظی ہے، نہ کوئی خود نمائی۔ وہ جس واقعے، شخصیت یا عہد کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ خود اس کے عینی شاہد ہوں۔

ان کا بنیادی میدان دہلی سلطنت اور مغلیہ عہد کی تاریخ ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اسلامی تہذیب، تصوف، مذہب، سیاست اور تمدن کے باہمی تعلق کو بھی ہمیشہ مدنظر رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک تاریخ محض ایک "ریکارڈ" نہیں بلکہ ایک "تعبیر" ہے جو قوموں کی روح میں جھانکنے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

دہلی سلطنت اور سلاطین کی تاریخ: ان کی معروف کتاب Some Aspects of

Religion and Politics in India during the Thirteenth Century (1961) کو اگر بغور پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ نظامی صاحب سیاسی تاریخ کو بھی صرف بادشاہوں، فتوحات اور حکمتِ عملی کی تفصیل تک محدود نہیں رکھتے، بلکہ وہ اس میں مذہب، عوام، صوفیاء، علما اور ثقافت کو بھی شریک کرتے ہیں۔ وہ دہلی سلطنت کو محض ایک حکومت نہیں بلکہ ایک تمدنی تجربہ سمجھتے ہیں، جہاں صوفیاء کا کردار محض روحانی نہیں بلکہ سماجی و سیاسی بھی تھا۔

انہوں نے دہلی سلطنت کے ابتدائی سلاطین خاص طور پر سلطان شمس الدین التمش، سلطان غیاث الدین بلبن اور سلطان علاء الدین خلجی کی سیاسی حکمت عملیوں کا گہرا تجزیہ کیا۔ وہ یہ دکھاتے ہیں کہ کس طرح مذہبی عوامل اور صوفی تحریکیں ان ادوار میں صرف پس منظر کی آوازیں نہیں تھیں بلکہ فیصلہ کن کردار ادا کرتی تھیں[1]۔

تاریخ نویسی کا انداز اور اصول: نظامی صاحب کی تاریخ نگاری کا ایک نمایاں پہلو مآخذ کے انتخاب میں دیانت اور وسعت ہے۔ ان کے نزدیک کوئی ماخذ خواہ کتنا ہی مستند کیوں نہ ہو، جب تک اس کا تجزیہ تنقیدی شعور کے ساتھ نہ کیا جائے، وہ محض بیان رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں ہمیں تاریخی تنقید، متعدد حوالہ جات کی باہمی تطبیق، اور سیاق و سباق کی وضاحت ساتھ ساتھ ملتی ہے[2]۔ مثال کے طور پر، جب وہ صوفیاء کے سیاسی اثرات پر بات کرتے ہیں تو صرف ملفوظات یا مریدوں کے اقوال پر انحصار نہیں کرتے، بلکہ معاصر مؤرخین جیسے ضیاء الدین برنی، امیر خسرو، اسد ملک وغیرہ کے بیانات کو بھی ساتھ لے کر چلتے ہیں۔

ان کے نزدیک ایک مؤرخ کی ذمہ داری صرف یہ نہیں ہے کہ وہ "کیا ہوا" کو لکھے، بلکہ وہ یہ بھی دریافت کرے کہ "کیوں ہوا"، "کس اثر کے تحت ہوا" اور "اس کے نتائج کیا نکلے"۔ یہی فلسفہ انہیں محض "معلومات دینے والے" مؤرخ سے نکال کر "فکر دینے والے" مؤرخ کی صف میں کھڑا کرتا ہے۔

---

(1) K. A Nizami. *Some Aspects of Religion and Politics in India during the Thirteenth Century*. Aligarh: Department of History, Aligarh Muslim University, 1961

(2) K. A Nizami. *Religion and Politics in India during the Thirteenth Century*. Oxford University Press, 2002 (reprint). See Chapter 3, pp. 67–84.

مؤرخ کی حیثیت سے مقام: وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے صدر رہے، اور بعد ازاں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائریکٹر بنے۔ ان کی قیادت میں یہ ادارہ محض درس و تدریس کا مرکز نہ رہا بلکہ ایک تحقیقی مکتبِ فکر بن گیا۔ ان کی تحقیق کا اسلوب بالکل ایسا ہے جیسے کوئی درویش وقت کے پردوں کو ہٹاتا جا رہا ہو، بغیر تعصب، بغیر شور، صرف سچائی کی تلاش میں۔

درویشی میں تحقیق کا نور: خلیق احمد نظامی کا اصل کمال صرف یہی نہیں کہ وہ تاریخ کو سمجھنے اور سمجھانے میں یکتا تھے، بلکہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے تصوف جیسے باریک، نازک اور بعض اوقات مبہم موضوع کو علمی معیار، فکری تنقید اور روحانی حساسیت کے ساتھ پیش کیا۔ اُن کے یہاں تصوف کوئی جذباتی وابستگی یا ادبی تأثر کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ وہ ایک تاریخی، سماجی، اور فکری حقیقت ہے۔جسے بغیر علمی بصیرت کے نہ سمجھا جاسکتا ہے، نہ بیان کیا جاسکتا ہے۔

تصوف، تاریخ، اور معاشرہ: نظامی صاحب کے نزدیک صوفیاء محض زہد و عبادت کی علامت نہیں تھے، بلکہ وہ معاشرے کے زندہ اور فعّال عناصر تھے۔ ان کی خانقاہیں نہ صرف روحانی تربیت کے مراکز تھیں بلکہ سماجی تبدیلی کے مراکز بھی۔ مثلاً ان کا مشہور مقالہ اس بات کا شاہکار ہے کہ وہ کس طرح صوفیاء تاریخی کردار کو خالص تنقیدی اور تجزیاتی انداز میں بیان کرتے ہیں[۳]۔ ان کے مطابق، صوفیاء نے نہ صرف مذہبی شعور کی آبیاری کی، بلکہ ہندو مسلم ہم آہنگی، اخلاقی اقدار اور عوامی فلاح جیسے مقاصد میں بھی انہوں نے کلیدی کردار ادا کیا۔ ان کی یہ رائے نہ جذباتی ہے، نہ رومانی؛ بلکہ تاریخی شواہد سے بھری ہوئی ہے۔

خواجہ نظام الدین اولیاءؒ: تاریخ اور روحانیت کا سنگم: خلیق احمد نظامی کی تصوف پر سب سے اہم اور معروف تصنیف ہے: Life and Times of Shaikh Nizam-u'd-din Auliya۔ یہ کتاب صرف ایک بزرگ کی سوانح عمری نہیں، بلکہ دہلی کے عہدِ وسطیٰ کی روحانی اور سماجی زندگی کا نقشہ ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ملفوظات، تاریخی مآخذ، درباری ریکارڈ، اور عوامی روایت کو ملاتے ہوئے ایک ایسا جامع اور فکری خاکہ پیش کیا ہے جس میں نہ صرف خواجہ

(3) K. A Nizami. "*The Role of Sufis in Medieval Indian Politics and Society*", in *Medieval India: A Miscellany*, Vol. 2. Aligarh: AMU Press, 1974

صاحب کی روحانی شان نظر آتی ہے بلکہ ان کے عہد کے سیاسی، تمدنی اور معاشرتی پہلو بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک خواجہ نظام الدین اولیاء کی اصل عظمت یہ تھی کہ وہ اقتدار سے دور رہ کر بھی اپنے دور کی روحانی قیادت کرتے تھے۔ انہوں نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ "نظام الدین اولیاء کی طاقت اپنے زمانے کے حکام کی مخالفت کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ ان سے آزاد رہنے کی وجہ سے تھی"[۴]۔

ملفوظات کا تحقیقی مطالعہ : نظامی صاحب نے ملفوظات کو عقیدت کی عینک سے نہیں پڑھا بلکہ ان کا انداز تنقیدی بھی ہے اور تجزیاتی بھی۔ وہ ملفوظات کو تاریخ کے ماخذ کے طور پر برتتے ہیں، مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ وہ ان کے سیاق و سباق کو نظر میں رکھتے ہیں، مختلف نسخوں کا تقابل کرتے ہیں، تصوف کے نظری مباحث کو عوامی سطح پر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہوں نے "فوائد الفواد" بنیادی مصادر کو صرف نقل نہیں کیا، بلکہ تشریح، توضیح اور تنقید کے مراحل سے گزار کر پیش کیا[۵]۔

مغربی و مشرقی تناظر کا امتزاج : خلیق احمد نظامی کی تصوف نگاری کی ایک اور اہم خوبی یہ ہے کہ وہ مغربی محققین کے نقطۂ نظر سے بھی واقف تھے، مگر ان کی تقلید نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے Richard Eaton, Annemarie Schimmel, Nicholson جیسے اسکالرز کا مطالعہ ضرور کیا، مگر اپنے موقف کو برصغیر کی فکری روایت سے جوڑے رکھا۔ ان کے نزدیک تصوف کی تعبیر صرف فلسفے یا تھیوری میں نہیں بلکہ اس کی عملی شکل یعنی خانقاہ، بیعت، اصلاح، خدمتِ خلق میں ہے۔

تاریخ اور تصوف کا امتزاج: ایک فکری وحدت کی تشکیل: خلیق احمد نظامیؒ کی تحریروں میں اگر ایک لہر ہے جو بار بار ابھرتی ہے تو وہ ہے تاریخ اور تصوف کے درمیان ایک مکالمہ۔ وہ اس مکالمے کے محض مترجم نہیں، بلکہ خود بھی ایک مکالمہ گر ہیں جو تاریخ کی آواز تصوف سے اور تصوف کی آواز تاریخ سے ہم آہنگ کرتا ہے۔

---

(۴) K.A. Nizami, *Life and Times of Shaikh Nizam-u'd-din Auliya*, New Delhi; Indrah-i Adabiyat-i Dilli, 1991. See Introduction, p.14.

(5) K. A. Nizami, *On History and Historians of Medieval India*. Munshiram Manoharlal, 1983

عام طور پر تاریخ اور تصوف کو دو الگ میدان سمجھا جاتا ہے: ایک کی بنیاد ثبوت پر، دوسرے کی وجدان پر۔ ایک میں حقائق کا مطالبہ، دوسرے میں تجربے کا انکشاف۔ مگر نظامی صاحب کے یہاں یہ دونوں نہ صرف ایک دوسرے سے متصادم نہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے نظر آتے ہیں۔

تصوف، محض روحانی تجربہ نہیں تاریخی مظہر بھی: نظامی صاحب نے بار بار اس نکتہ پر زور دیا کہ صوفیاء کی فکر، ان کا رویہ، ان کی خانقاہیں، ان کی اصلاحی کوششیں، سب تاریخ کا حصہ ہیں۔ ہم اگر صرف سیاسی بادشاہوں کو تاریخ کا مرکز سمجھیں گے تو ہم تہذیبی تاریخ کی روح سے محروم ہو جائیں گے۔ اسی لیے وہ خواجہ غریب نواز، نظام الدین اولیاء، شاہ کلیم اللہ اور مجدد الف ثانی جیسے بزرگوں کو صرف روحانی شخصیات نہیں مانتے، بلکہ سماج ساز، قوم ساز اور تہذیب ساز افراد کے طور پر دیکھتے ہیں۔

تاریخ کو روح کی روشنی میں دیکھنا: نظامی صاحب کے یہاں ایک باریک نکتہ یہ بھی ہے کہ جب آپ تاریخ کو صرف طاقت کے زاویے سے دیکھتے ہیں تو وہ بے رحم اور سرد ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر آپ اس میں روحانیت کی روشنی شامل کر دیں تو وہ ایک زندہ، متحرک اور بامعنی داستان بن جاتی ہے۔ اسی لیے وہ لکھتے ہیں کہ:

The real forces of history are not always those which occupy thrones, but often those who sit in silent corners of khanqahs.[۶]

(تاریخ کی حقیقی طاقتیں ہمیشہ وہ نہیں ہیں جو تختوں پر بیٹھتی ہیں بلکہ اکثر وہ ہیں جو خانقاہوں کے خاموش زاویوں میں بیٹھتی ہیں)۔ یہ جملہ ان کی فکر کا نچوڑ ہے۔

تاریخ کی تحقیق میں تصوف کی اہمیت: نظامی صاحب کا اصرار تھا کہ صوفی تحریکوں کے بغیر ہم ہندوستانی معاشرے کی ترقی یا زوال کو مکمل طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ نہ صرف مسلم سماج بلکہ ہندو مسلم تعلقات، ثقافتی میل جول اور سماجی اصلاحات، سب میں خانقاہی نظام کا کردار موجود ہے۔ اسی لیے ان کے بیشتر تاریخی مضامین میں صوفیاء کا ذکر محض اضافی نہیں بلکہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔

---

[۶] K. A Nizami. *On History and Historians of Medieval India*, p. 113

نظامی صاحب کی نثر اور اسلوب: سادگی میں تاثیر، علم میں ادب: کچھ تحریریں ایسی ہوتی ہیں جو معلومات فراہم کرتی ہیں، اور کچھ ایسی ہیں جو آپ کے اندر روشنی پیدا کرتی ہیں۔ خلیق احمد نظامی کی نثر اسی دوسری قسم سے تعلق رکھتی ہے۔ سادہ، رواں، بے تصنع، مگر اثر انگیز جیسے کوئی درویش خموشی سے بیٹھ کر آپ سے دل کی باتیں کر رہا ہو اور آپ خود بھی بے اختیار خاموشی سے سنتے چلے جائیں۔ نظامی صاحب کی نثر میں کوئی لفاظی نہیں، کوئی خطیبانہ زور نہیں، کوئی مصنوعی علمی بوجھ نہیں لیکن جو کچھ ہے وہ ایک خالص صداقت، ایک فکری وقار، اور ایک تہذیبی شائستگی ہے۔

علمی وقار کے ساتھ بیانیہ تسلسل: نظامی صاحب کی تحریروں سے محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی شخص تاریخ کا پیچیدہ موضوع لے کر آہستہ آہستہ، دھیرے دھیرے آپ کو اس کے اندر لے جا رہا ہو، بغیر زور دیے، بغیر جبر کیے۔ ان کے جملے چھوٹے ہوتے ہیں، مگر خیال مکمل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کا یہ جملہ: The Sufi's influence did not lie in his opposition to power, but in his moral detachment from it.[۷] (صوفی کا نفوذ اس کے اقتدار سے اختلاف کی وجہ نہیں تھا بلکہ اقتدار سے ایک اخلاقی دوری بنائے رکھنے کی وجہ سے تھا)۔ کتنی آسان زبان، مگر کتنا گہرا مطلب! یہی وہ انداز ہے جس نے ان کی تحریروں کو عام قاری کے لیے قابلِ فہم اور علمی دنیا کے لیے معتبر بنا دیا۔

ادبیت کی خوشبو: اگرچہ وہ بنیادی طور پر ایک مؤرخ اور محقق تھے، مگر ان کی نثر میں ایک ادبی خوشبو بھی موجود ہے، جو نہ تو نثر کو شاعری بناتی ہے، نہ بے ذائقہ چھوڑتی ہے، بلکہ ایک معتدل لطافت بخشتی ہے۔ وہ کہیں بھی خطیبانہ انداز اختیار نہیں کرتے، مگر قاری کو دل سے گرفت میں لے لیتے ہیں۔ ان کے مقدمات، تعارف اور دیباچے اس اسلوب کے بہترین نمونے ہیں۔ مثال کے طور پر "سوانح حضرت نظام الدین اولیاء" کا دیباچہ پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف ایک شخصیت کا خاکہ نہیں، بلکہ پورے عہد کی روح کو پیش کر رہے ہیں۔

روایت سے جڑا، وقت سے ہم آہنگ: نظامی صاحب کا اسلوب اردو کی تاریخی نثر سے جڑا ہوا

---

(۷) K. A Nizami. *Life and Times of Shaikh Nizam-u'd-din Auliya*, Introduction, p. 14

ہے - یعنی وہ شبلی، سید سلیمان ندوی اور عبدالحلیم شرر جیسے بزرگوں کی روایت کے امین نظر آتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ان کی نثر میں عصری شعور اور سادگی بھی جھلکتی ہے جو عصری قاری کے لیے اجنبی نہیں بلکہ مانوس محسوس ہوتی ہے۔ یہی وہ "بیانیہ توازن" ہے جس نے ان کی تحریروں کو کلاسیکی بھی بنایا، اور آج کے قاری کے لیے زندہ بھی رکھا۔

دیگر علمی خدمات اور اثرات: نسلوں کی تربیت، علمی روایت کا تسلسل: کچھ لوگ صرف کتابیں لکھتے ہیں، اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو ذہنوں کو تراشتے ہیں، نسلوں کی تربیت کرتے ہیں، اور علمی روایت میں جان ڈال دیتے ہیں۔ خلیق احمد نظامیؒ بلاشبہ انہی میں سے تھے۔ ان کا کردار صرف ایک مؤرخ، محقق یا مصنف کا نہیں تھا، بلکہ وہ ایک مرشدِ علم تھے جنہوں نے اپنے زمانے کے تعلیمی، تحقیقی اور فکری ماحول کو متأثر بھی کیا اور نکھارا بھی۔

علی گڑھ کی علمی فضا میں ان کی موجودگی: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جہاں وہ کئی دہائیوں تک تدریس، تحقیق اور قیادت سے وابستہ رہے، اُن کے وجود سے صرف ایک ادارہ نہیں، بلکہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر گئی۔ وہ وہاں صرف پروفیسر نہیں تھے - وہ طلبہ کے لیے فکری رہنما، اساتذہ کے لیے مثالی منتظم اور علمی اداروں کے لیے نظم و نسق کا قابلِ اعتماد مرکز تھے[۸]۔ انہیں ۱۹۷۴ میں شعبۂ تاریخ کا صدر بنایا گیا، پھر ڈین فیکلٹی آف آرٹس اور بعد میں نائب وائس چانسلر بھی رہے۔ مگر ان تمام عہدوں میں اُن کی اصل پہچان اُن کی علم دوستی، سادگی اور علمی وابستگی ہی رہی[۹]۔

دارالمصنّفین اعظم گڑھ سے وابستگی: ان کی ایک اور اہم علمی وابستگی دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ سے بھی رہی۔ وہ معارف کے مستقل معاونین میں سے تھے، اور اس ادارے کو فکری، علمی، اور تحقیقی سطح پر مسلسل رہنمائی دیتے رہے[۱۰]۔ ان کی تحریریں، مقالات اور کتابیں دارالمصنّفین کے ذخیرے میں آج بھی تحقیق کے اعلیٰ معیار کا نمونہ سمجھی جاتی ہیں۔

شاگردوں کی تربیت: نظامی صاحب کا اصل کارنامہ صرف اپنی علمی خدمات ہی نہیں، بلکہ وہ

---

(۸) Faruqui, A. R. (ed.). *K. A. Nizami: Historian and Thinker*. Aligarh: Centre of Advanced Study, AMU, 2001, pp. 11-15

(۹) *Ibid.,* pp. 22–24

(۱۰) دیکھئے معارف، خلیق احمد نظامی پر خصوصی اشاعت، اپریل ۲۰۰۵، ص۹-۱۳۔

شاگردوں کی ایک ایسی نسل چھوڑ گئے جنہوں نے خود تحقیق، تدریس اور تصنیف کے میدان میں گہرے نقوش چھوڑے[11]۔ ان کے شاگردوں میں کئی معروف مؤرخین، اسکالرز، اور یونیورسٹی پروفیسرز شامل ہیں- جنہوں نے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بین الاقوامی جامعات میں بھی ان کے افکار کو آگے بڑھایا۔ ان کی تربیت کا انداز ایسا تھا کہ وہ صرف معلومات ہی نہیں فراہم کرتے تھے، بلکہ سوچنے کا طریقہ سکھاتے تھے۔ ان کی کلاس میں بیٹھنا صرف ایک لیکچر سننا نہیں ہوتا تھا، بلکہ فکر کی ایک نئی دنیا میں قدم رکھنا ہوتا تھا۔

علمی مزاج اور اخلاقی وقار: ان کے بارے میں ایک بات سب کہتے ہیں کہ اُن میں علمی انکساری تھی، شخصی وقار تھا اور مزاج میں نرمی تھی[12]۔ وہ کسی پر اپنی علمی برتری جتاتے نہیں تھے، بلکہ محبت سے علم بانٹتے تھے۔ ان کی محفل میں اختلاف رائے کی گنجائش تھی اور ان کے رویے میں بردباری۔ یہی وہ اوصاف تھے جنہوں نے انہیں ایک علمی بزرگ کی صورت دے دی تھی۔

نظامی صاحب کا فکری ورثہ: خلیق احمد نظامیؒ کی تحریریں صرف تاریخی یا صوفیانہ بیانات نہیں، بلکہ انسانی شعور کی تہذیب کا استعارہ ہیں۔ اُن کے یہاں تاریخ، صرف ماضی کا بیان نہیں، بلکہ ایک اخلاقی و فکری مکالمہ ہے جو آج کے انسان کو اپنے مقام، اپنی قدروں اور اپنے تشخص پر سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ اُنہوں نے تاریخ نویسی کو روحانیت کے نور سے منور کیا، اور تصوف کو علمی وقار بخشا[13]۔ ان کے قلم کی روانی میں صوفیانہ لطافت بھی تھی، اور محققانہ سخت گیری بھی۔ وہ نہ یکسر روایتی تھے، نہ بے لگام جدت پسند۔ ان کی فکری تشکیل ایک توازن کی مثال ہے جہاں ماضی سے محبت اور حال کی بصیرت باہم شیر وشکر نظر آتی ہے[14]۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اُنہوں نے ہندوستانی تہذیب، اسلامی روحانیت اور علمی صداقت کو یکجا کیا۔ ان کے مضامین میں نہ

---

(۱۱) S. A. A Rizvi, *A History of Sufism in India*, New Delhi: Munshiram Manoharlal, 1992, vol. 2, p. 340

(۱۲) طلبہ اور ساتھیوں کی یادداشت: معارف، اپریل ۲۰۰۵، ص ۲۸-۳۲۔

(۱۳) K. A Nizami. *Some Aspects of Religion and Politics in India during the 13th Century*. Aligarh: Department of History, AMU, 1961, p. vii

(۱۴) Faruqui, A. R. (Ed.). *K. A. Nizami: Historian and Thinker*. Aligarh: Centre of Advanced Study, AMU, 2001 pp. 35–38

کوئی فرقہ واریت ہے، نہ تعصب؛ نہ تقلید کا جمود ہے، نہ تجدد کا غرور۔ وہ تاریخ کو دھڑکتے ہوئے دل کی طرح پڑھتے تھے جہاں بادشاہ، صوفی، عوام اور خیالات، سب کی نبض محسوس کی جاسکتی ہے(۱۵)۔

آج کا مؤرخ جب ماضی کی طرف دیکھتا ہے تو یا تو وہ واقعات کی سطحی گنتی کرتا ہے، یا پھر جدید نظریات کی عینک سے سب کچھ رنگ دیتا ہے۔ نظامی صاحب کا انداز ان سے مختلف تھا۔ وہ تاریخ کو روح کی گہرائی سے پڑھتے تھے اور قاری کو اس میں شریک کرتے تھے(۱۶)۔ انہوں نے جو منہجِ تحقیق دیا، جو اسلوبِ تحریر سکھایا اور جو اندازِ نظر چھوڑا، وہ آنے والی نسلوں کے لیے نہ صرف قابلِ تقلید ہے بلکہ لازمی سرمایہ ہے۔

نظامی صاحب کی شخصیت کو جو لوگ قریب سے جانتے تھے، وہ اس بات پر متفق ہیں کہ وہ بے حد باوقار اور انتہائی بردبار تھے۔ اُن کی باتوں میں شوخی نہ سہی، مگر علم کی گرمی اور اخلاق کی نرمی ضرور تھی۔ ان کی موجودگی، ان کی مسکراہٹ، ان کے جملے- سب کچھ آج بھی اُن کے شاگردوں اور قارئین کے دلوں میں زندہ ہے۔

مراجع و مصادر

1. Nizami, K. A. *On History and Historians of Medieval India*. New Delhi: Munshiram Manoharlal, 1983.
2. Nizami, K. A. *Life and Times of Shaikh Nizam-u'd-din Auliya*. New Delhi: Idarah-i Adabiyat-i Delli, 1991.
3. Nizami, K. A. *Some Aspects of Religion and Politics in India during the 13th Century*. Aligarh: Department of History, AMU, 1961.
4. Faruqui, A. R. (Ed.). *K. A. Nizami: Historian and Thinker*. Aligarh: Centre of Advanced Study, AMU, 2001.
5. Rizvi, S. A. A. *A History of Sufism in India*, Vol. 2. New Delhi: Munshiram Manoharlal, 1992.
6. Maarif "یادگارِ نظامی نمبر" (ماہنامہ معارف) (Memorial Number on K. A. Nizami). April 2005. Azamgarh: Darul Musannifeen Shibli Academy.
7. Personal Interviews and Anecdotes, as quoted by students and colleagues of K. A. Nizami in *Maarif*, April 2005 issue.

---

(۱۵) S. A. A. Rizvi. *A History of Sufism in India*, Vol. 2. New Delhi: Munshiram Manoharlal, 1992, p. 336.

(۱۶) معارف، "یادگارِ نظامی" خصوصی نمبر، اپریل ۲۰۰۵، ص ۱۷-۱۹۔

فکر اقبال کا انقلابی پہلو

ڈاکٹر محمد ارشد

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، مہاراج بلونت سنگھ پی-جی-کالج، گنگاپور وارانسی، ۲۲۱۳۰۲

ma881486@gmail.com

علامہ اقبال ایک عظیم المرتبت شاعر ہونے کے ساتھ ایک سیاسی وسماجی مفکر بھی تھے۔ انھوں نے ملت اسلامیہ کی پس ماندگی کے ساتھ تمام بنی نوع انسان کی زبوں حالی اور اس کے مستقبل اور مقدر کے بارے میں نہایت دردمندی اور استغراق کے ساتھ غور کیا تھا۔ ہر چند کہ ان کے نظامِ افکار میں فلسفۂ خودی، بے خودی، تصورِ عشق، مرد مومن، نظریۂ عمل اور تصورِ زمان ومکان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، تاہم اور بھی بہت سی صفات ہیں جو اقبال کے فکر وفن کی جہت متعین کرنے میں اساسی کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کی شاعری اور افکار میں اہم عنصر اس کا انقلابی پہلو ہے۔ وہ صرف عالمِ اسلام ہی نہیں بلکہ تمام دنیا میں انقلاب کے خواہاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں بھی تبدیلی کے آثار نظر آئے، اقبال نے اسے خوش آئند اور جہان تازہ سے تعبیر کیا۔ منفی پہلوؤں کو درکنار کرتے ہوئے اس کے مثبت اقدام کی طرف توجہ دی۔ ظلم وستم سے بنی نوع انسان کو نجات دلانے اور غلامی ومحکومیت سے آزاد کرانے کے لئے اقبال نے ہر اس انقلاب کا خیر مقدم کیا جس میں انسانیت کی فلاح وبہبود مضمر تھی۔ لوتھر کی اصلاحی تحریک ہو یا انقلابِ فرانس کا جمہوریت، اخوت اور مساوات کا نعرہ، مسولینی کی انقلابی کوشش ہو یا روس کا اشتراکی انقلاب، جمال الدین افغانی کی عالمگیر مسلم اخوت کی بات ہو یا ایران وترکی میں رضا شاہ اور مصطفی کمال پاشا کے جرأت مندانہ اقدامات اور ترقی پسند خیالات کی توسیع، ان سب کی صدائے بازگشت اقبال کے کلام میں سنائی دیتی ہے۔

عہد اقبال سے لے کر آج تک "انقلاب" کا سیاسی وعمرانی فلسفہ بہت زیادہ اہمیت حاصل کر چکا ہے۔ لیکن استعمار واستحصال کے خلاف سب سے پہلے اردو شاعری میں مؤثر طریقے سے انقلاب کا نعرہ اقبال ہی نے بلند کیا علی سردار جعفری لکھتے ہیں:

انقلاب کا لفظ سیاسی وسماجی تبدیلیوں کے معنوں میں پہلے اقبال نے استعمال کیا۔ اور سیاسی

انقلاب کا تصور اردو شاعری کو اقبالؔ ہی نے دیا۔ اس طرح سرمایہ دار، مزدور، زمیندار، کسان، آقا، غلام، حاکم و محکوم کی باہمی کشمکش کے موضوعات پر سب سے پہلے اقبالؔ نے نظمیں کہیں۔(۱)

انقلاب حیاتِ انسانی کی ایک زندہ حقیقت ہے جس کا مطلب نظام کی تبدیلی ہے۔ لیکن اقبال کا تصورِ انقلاب مروجہ معانی و مفاہیم سے مختلف ہے۔ ان کے نزدیک انقلاب کسی قوم کی اس ذہنی، فکری اور عملی تبدیلی سے عبارت ہے۔ انقلاب جس جذبے سے وجود میں آتا ہے، اقبالؔ اسے عشق کا نام دیتے ہیں سہل پسندی اور انجماد و سکون سے نظامِ حیات میں کوئی انقلاب پیدا نہیں ہوتا۔ خلیفہ عبدالحکیم رقم طراز ہیں:

> اقبالؔ کے لئے ہر وہ تحریک خوش آئند تھی جو زندگی کے جمود کو توڑے۔ لیکن اس کی طبیعت ایسے ہمہ گیر انقلاب کی آرزو مند تھی جو سیاست و معاشرت میں نہیں، بلکہ انسان کی فطرت میں کوئی نمایاں تبدیلی پیدا کرے۔(۲)

"پیام مشرق" کے دیباچے میں خود اقبالؔ نے اپنے نظریۂ انقلاب کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

> حقیقت یہ ہے کہ اقوام عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم محض اس واسطے نہیں لگا سکتے کہ خود ہم اس اضطراب سے متأثر ہیں، ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا۔ اور تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا کی تعمیر کر رہی ہے۔(۳)

اقبالؔ کے انقلاب سے مراد وہ روحانی اور تمدنی انقلاب ہے جو انسان کے فکر و شعور میں نمایاں تبدیلی پیدا کرے۔ اسی مضمون میں اپنے خیالات کی مزید وضاحت اقبالؔ نے اس طرح کی ہے:

> مشرق بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے۔ مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کرلینا چاہئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب

(۱) علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، ۲۰۱۳، ص ۱۲۸

(۲) خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۲، ص ۱۱۳

(۳) سید عبدالواحد معینی (مرتب)، مقالات اقبال، آئینہ ادب لاہور، ۱۹۸۸، ص ۲۴۸

تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو۔ اور کوئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسان کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔[۴]

اقبال کے نزدیک انقلاب کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس کا وجود انسان کے ضمیر میں پیدا ہو، تب کہیں جا کر خارجی دنیا میں انقلاب برپا ہو گا۔ جب تک کوئی قوم اپنے اندرون میں تبدیلی پیدا نہیں کرتی اللہ تعالیٰ اس قوم کی ظاہری حالت میں بھی کوئی تغیر و تبدل پیدا نہیں کرتے۔

اقبال نے ۱۹۰۴ میں "قومی زندگی" کے عنوان سے ایک مضمون میں قوموں کے عروج وزوال کے اسباب و عوامل کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ہاتھوں کی لڑائی کا زمانہ گذر چکا ہے۔ اب دماغوں، تہذیبوں اور تمدنوں کی ہنگامہ آرائی کا وقت ہے۔[۵]

اقبال کا خیال ہے کہ زندگی کے متغیر حالات کے ساتھ مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کی جائے اور اصلاحِ تمدن اور تعلیم کی طرف توجہ مبذول کی جائے۔ کیونکہ وہی قومیں مصافِ ہستی میں خود کو زندہ اور باقی رکھنے میں کامیاب ہو سکتی ہیں جنھوں نے نظریۂ ارتقاء پر عمل کرتے ہوئے تعلیم اور تمدن پر اپنی توجہ مرتکز کی ہو اس بنیادی نکتے پر زور دینے کے لئے اقبال نے جاپان میں نئی زندگی کی حرارت، توانائی اور عزم و حوصلے کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے جاپان سے سبق لینے پر زور دیتے ہیں:

جاپانیوں کی باریک بیں نظر نے اس عظیم الشان انقلاب کی حقیقت کو سمجھ لیا ہے اور وہ راہ اختیار کی جو ان کی قومی بقا کے لئے ضروری تھی۔ افراد کے دل و دماغ دفعتاً بدل گئے اور تعلیم و اصلاح تمدن نے قوم کی قوم کو اور سے کچھ اور بنا دیا۔[۶]

اسی مضمون میں انسان کی خودی کو بیدار کرتے ہیں کہ "دنیا میں کسی قوم کی اصلاح نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس قوم کے افراد اپنی ذاتی اصلاح کی طرف توجہ نہ دیں۔"[۷]

اقبال کے نزدیک اصلاح و تغیر کا جو بھی قدم اٹھے پہلے اس کا رخ فرد کی ذاتی اصلاح کی طرف ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ نیا جہاں سنگ و خشت کا نہیں، بلکہ تازہ افکار و خیالات کا ہے۔ اسی خیال کو

---

[۴] ماخذ سابق، ص ۲۴۸ - ۲۴۹

[۵] ماخذ سابق، ص ۷۵

[۶] تصدق حسین خاں (مرتب)، مضامین اقبال، حیدرآباد دکن، ۱۹۶۲ء ص ۳۵ - ۳۶

[۷] ماخذ سابق، ص ۳۹

اقبال نے 'ضرب کلیم' میں ایک جگہ اس طرح بیان کیا ہے:

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفَس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا

عصری مسائل پر اقبال نے اپنی نثر و نظم دونوں میں اظہار خیال کیا ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کے مسائل کو ایک حکیم کی نگاہ سے دیکھا، اوراس کے تئیں اپنے فنکارانہ ردِّ عمل کا اظہار کیا۔ حرکت، حرارت اور انقلاب اقبال کی فکر کے بنیادی محرکات ہیں۔ حصولِ مقصد کی کشمکش، عظمتِ انسان پر یقین اور قوتِ حیات کی جستجو نے انھیں ایک ایسی فکر اور جذبے سے معمور کر دیا تھا جس نے ان کی فکر کو انقلابی آہنگ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ شاعری اقبال کے نزدیک مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک وسیلۂ اظہار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے نزدیک شاعری کی اہمیت ثانوی ہے اور افکار و تصورات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے کلام میں جو جاذبیت اور گہرائی ہے، وہ ان کے فکر عمل کی رہینِ منت ہے۔ سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمحِ نظر نہیں رہا۔ فن کی باریکیوں پر توجہ دینے کیلئے فرصت نہیں۔ مقصود یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں، ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔(۸)

اسی خیال کو اقبال متعدد جگہ نمایاں کیا ہے جیسے:

مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور
عطا ہوا مجھے ذکر و فکر و جذب و سرور

تخلیق و تفکر میں ہم آہنگی، مقصدیت پر زور، علوم و فنون کے امتزاج اور عام تجربات ومشاہدات نے اقبال کے ذہن وشعور کی آبیاری کی۔ اسی روشنی میں اقبال مشرق ومغرب دونوں سے بیزار ہیں۔ انھوں نے مغرب کی روشن خیالی، مادّی ترقی اور تہذیبی وثقافتی استعماریت کو ہدفِ تنقید بنایا، وہیں تو مشرق کی اخلاقی تنزلی اور روحانیت کو بھی نشان زد کیا:

---

(۸) سید مظفر حسین برنی (مرتب)، کلیات مکاتیب اقبال دوم، اردو اکادی دہلی، ۱۹۹۳، ص ۱۳۷

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

اقبالؔ کے نزدیک مشرق میں زندگی کی حرارت ہے اور نہ ہی مغرب میں سوزوسازِ حیات ہے۔ دونوں ہی ذوقِ عمل سے عاری ہیں۔ اس لئے اقبالؔ جہاں ولولۂ انقلاب دیکھتے ہیں تو اسے خوش آئند قرار دیتے ہیں۔ 'ضرب کلیم' کی نظم ''انقلاب'' میں یہ کیفیت دیکھیے:

نہ ایشیا میں نہ یورپ میں سوز و سازِ حیات
خودی کی موت ہے یہ، اور ضمیر کی موت
دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا
قریب آگئی شاید جہانِ پیر کی موت

وہ جہانِ تازہ کے مشتاق تھے۔ اس جہانِ رنگ وبو کو انسان کی میراث تصور کرتے تھے۔ اس تصور کے پسِ پشت اسلام کا متحرک اور انقلابی تصورِ زیست کار فرما تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ نئی دنیا کی تعمیر سے پہلے فرسودہ اور کہنہ نظام حیات کو ختم کرنے پر زور دیتے ہیں:

سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

بانگ درا میں ''ارتقاء'' نظم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ زمانے کی کشمکش اور کوشش پیہم سے ہی دنیا میں اقوام کا وجود باقی رہتا ہے اور یہی اسلام کا فلسفہ بھی ہے:

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

فکر اقبالؔ کا بنیادی نکتہ یہی ہے کہ اگر فرد اور اجتماع میں ہر لحظہ، نیا طور، نئی برق تجلی کے آثار نہ ہوں تو قومیں صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ جاتی ہیں۔ ہر جگہ خوب سے خوب تر کی تلاش کا جذبہ کار فرما ہونا چاہیے۔ ''مسجد قرطبہ'' میں وہ افراد اور اقوام کے لئے کشمکشِ انقلاب کو ناگزیر خیال کرتے ہیں:

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب
صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

انقلاب کا ذوق فرد میں ہو یا معاشرے میں اس سے فرد کی زندگی میں تبدیلی واقع ہوتی ہے، ملتوں کو بھی عروج حاصل ہوتا ہے اور:

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا ہے؟ ملّت کا شباب
ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارا لعلِ ناب

اقبال کا فارسی کلام بالخصوص 'پیام مشرق' اور 'زبور عجم' پوری طرح انقلابی آہنگ سے لبریز ہے۔ زبورِ عجم کی ایک نظم "خواجہ و مزدور" میں جہاں انھوں نے روحانی ثروت مندی کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے، وہیں مادی زندگی کو انقلاب آشنا کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے۔ یہ نظم شروع سے آخر تک زبردست انقلابی آہنگ سے معمور ہے:

من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام
آں چناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب

انقلاب!

انقلاب اے انقلاب

اس طرح اقبال کے اردو، فارسی کلام اور تحریروں میں ان کے افکار و تصورات میں انقلابی کردار کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اقبال کے افکار میں مرد مومن، مرد کامل اور مسلمانوں کے روحانی ارتقاء کو اولین اہمیت حاصل ہے۔ تاہم ان کی فکر کی جستجو کا محور ایک ایسے انقلابی کردار و عمل کی تقویم تھی جس میں انسان ہر قسم کی مادی قوتوں کی تسخیر کرسکے اور روحانی مدارج طے کرکے بندۂ مومن اور بندۂ مولا صفات کا نمونہ پیش کرسکے۔

اقبال کی زندگی میں مشرق و مغرب میں انقلاب آفریں تبدیلیاں رونما ہورہی تھیں۔ مشرق کی جہاں گیریاں ختم ہوچکی تھیں اور مغرب کی بالادستی پر اپنا دبدبہ قائم کررہی تھی۔ اس کے شانہ بہ شانہ مغربی افکار و خیالات مشرق پر شدت کے ساتھ اثر انداز ہو رہے تھے۔ اہل مشرق احساس کمتری اور مرعوبیت کے شکار تھے۔ دنیا میں اس طرح کے حالات، انقلاب کے لئے راہ نما بن جاتے ہیں۔ پیام مشرق کے دیباچے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال رقم

طراز ہیں:(۹)

> یورپ نے اپنے علمی، اخلاقی اور اقتصادی نصب العین کے خوفناک نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اس کے نکتہ رس مگر قدامت پسند مدبرین اس حیرت انگیز انقلاب کا صحیح اندازہ کر نہیں سکے جو انسانی ضمیر میں اس وقت واقع ہو رہا ہے۔(۱۰)

اقبالؔ کی فکر کا ایک انقلابی پہلو یہ ہے کہ انھیں مغربی تہذیب و تمدن اور معاشرت کے کم و بیش سارے تضادات کا عرفان حاصل تھا۔ اس سلسلے میں جن بصیرت افروز خیالات کا اظہار کیا اور نکتہ رس اور معنی خیز تنقید کی، اسکی نظیر کسی دوسرے اردو شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں مغرب کے نو آبادیاتی منصوبوں، سرمایہ دارانہ وجمہوری نظام اور تہذیبی وثقافتی استعماریت کو انتہائی منفرد اور مفکرانہ انداز میں ہدف تنقید بنایا۔ اس سلسلے میں اکبرؔ الہ آبادی پیش رفت کر چکے تھے۔ انھوں نے اپنے مخصوص طنزیہ وظریفانہ انداز میں مغربیت کا پردہ چاک کیا۔ لیکن اقبالؔ نے اسے طنز کے محدود دائرے سے نکال کر فکر کی فلسفیانہ بلندیوں تک پہنچا دیا۔ انھوں نے مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام، ظلم و بربریت اور استحصال کے طریقے کو نشانۂ ملامت بتاتے ہوئے اہل مغرب کو یہ باور کرایا کہ تم اپنی جس تہذیب پر نازاں ہو، یہ تہذیب اخلاقی اور انسانی قدروں سے بالکل عاری ہو چکی ہے اور تمہاری یہ خود ساختہ تہذیب خود تمہارے لئے ہی تباہی کا باعث ہو گی۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، نا پائدار ہو گا

یہ حقیقت ہے کہ برطانوی سامراج کی عمارت تیسری دنیا بالخصوص مشرقی ملکوں کے سیاسی اور اقتصادی استحصال کی بنیادوں پر قائم ہوئی تھی۔ متعدد مفکرین نے ان پہلوؤں کی نشاندہی ابتداء ہی میں کر دی تھی۔ اقبال برطانوی سامراج کے ان منصوبوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ انھوں نے سیاسی اور معاشی غلبہ واستبداد کے علاوہ مشرق کے تہذیبی استحصال کی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے اور اپنی تخلیقات کے ذریعے اس صداقت کو روشن کیا کہ کس طرح مغربی طاقتیں سیاسی ومعاشی اور اقتصادی منصوبوں کی تکمیل کے لئے تیسری دنیا بالخصوص مشرقی ممالک کو غلام اور محکوم بنانا چاہتی

---

(۹) سید عبد الواحد معینی (مرتب)، مقالات اقبال، آئینہ ادب لاہور، ۱۹۸۸، ص ۲۴۸
(۱۰) جگن ناتھ آزاد، ”اقبال، اسلام اور اشتراکیت“، معارف اعظم گڑھ، فروری ۱۹۷۶، ص ۱۰۳

ہیں۔ وہ یورپ کے فکر و فلسفہ، علم و حکمت، تدبر، حکومت اور تعلیم مساوات وغیرہ تمام چیزوں کو سامراجی منصوبوں کی تکمیل کا آلۂ کار قرار دیتے ہیں۔ اقبالؔ ان انقلابی مفکرین میں سے تھے جنھوں نے اس حقیقت کو طشت ازبام کیا کہ یوروپی سامراج اپنے جلو میں سیاسی تسلط کے علاوہ تہذیبی استحصال کے کیسے کیسے خطرناک منصوبے رکھتا ہے۔

مغرب کی سامراجی قوتوں نے اپنے نظام تعلیم اور ڈسکورس کے ذریعے ہمیں جمہوریت، اخوت، مساوات، فرد کی آزادی جیسی اصطلاحوں کے ذریعے یہ تأثر دینے کی کوشش کی کہ گویا یہ سامراجی قوتیں صحیح معنوں میں انسان دوستی، روشن خیالی اور وسیع المشربی کی علمبردار ہیں جب کہ یہ نظامِ کلام اور ڈسکورس اپنی نوعیت کے اعتبار سے سیاسی تھا۔ اور مشرق کے معاشی اور تہذیبی استحصال کا آلۂ کار۔ اقبالؔ نے اپنے کلام کے ذریعے اس حقیقت کو آشکار کیا۔ ’’لینن خدا کے حضور میں‘‘ کی یہ سطریں اس کا بین ثبوت ہیں:

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

۱۹۱۷ میں روس میں اشتراکیت کی شکل میں ایک عالمگیر انقلاب آیا، جس کے پس منظر میں اقبالؔ نے خضرِ راہ، طلوع اسلام اور نوائے مزدور، جیسی معرکۃ الآراء نظمیں تخلیق کیں۔ ان نظموں کے بارے میں عام خیال یہی ہے کہ یہ انقلابِ روس سے متأثر ہو کر لکھی گئی ہیں حالانکہ ان نظموں میں تخلیقی حسن کے ساتھ ساتھ دنیا کی سیاسی صورت حال کے بارے میں جو انقلابی بصیرت مضمر ہے اور دنیا کے دبے کچلے اور کمزور انسانوں کے مستقبل کے بارے میں جو سیاسی لائحۂ عمل موجود ہے، وہ صرف انقلاب روس کی دین نہیں ہو سکتی۔ ان میں اقبالؔ کی انسان دوستی بھی شامل ہے اور ان کے فلسفے کا عکس بھی جھلکتا ہے۔ اقبالؔ کے نظام فکر میں جو چیز اہم عنصر کی حیثیت رکھتی ہے، اس میں بنی نوع انسان سے محبت اور اس کے مسائل و مقدر کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ہر بڑے فنکار کی طرح ان کی فکر کا بنیادی محور انسان کی ذات رہی ہے اور اس کی عظمت کو نمایاں کرنا ہی ان کی فکر کا بنیادی وظیفہ رہا ہے۔ اقبالؔ فطرتاً ایک انقلاب پسند مفکر تھے۔ اس لئے ہر ایسی تحریک یا انقلابی کوشش جس کا مقصد و منتہا انسانیت کی فلاح و بہبود رہا ہے۔ اس کا ذکر انہوں نے نہایت خلوص اور دردمندی کے ساتھ کیا ہے۔ جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

ایسا حساس فنکار اس سے متأثر ہی نہ ہو۔ لیکن متأثر ہونا اور بات ہے اور اپنا نظریہ اور عقیدہ اس کی نذر کر دینا، دوسری بات۔ اقبال اس انقلاب سے صرف متأثر ہی ہوئے، اور متأثر ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اسلام بھی ملوکیت اور سرمایہ داری کا دشمن ہے اور انقلابِ روس نے بھی ملوکیت اور سرمایہ داری کو اپنا نشانہ بنایا۔ ورنہ جہاں تک مارکس کے نظریۂ اشتراکیت کا تعلق ہے، اقبال کے لئے اس نظریے کو قبول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ایک اشتراکی کے لئے خدا، روح اور مذہب تینوں سے انکار لازمی ہے"۔[۱۱]

"خضر راہ" میں، جو فکری اور فنی اعتبار سے اقبال کے شاعرانہ ارتقاء میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے، اقبال کے فکر کا انقلابی پہلو سامنے آتا ہے۔ بقول عزیز احمد "خضر راہ سے اقبال کی شاعری کا انقلابی دور شروع ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد ان کی شاعری کا ایک بڑا اور اہم موضوع طبقاتی کشمکش اور سرمایہ و محنت کی آویزش ہے"[۱۲] زیرِ تبصرہ نظم میں اقبال نے مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام، جمہوری طرز حکومت، زندگی، سلطنت کی حقیقت و ماہیت اور سرمایہ و محنت کش کی کشمکش کے متعلق جن بصیرت افروز خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ اقبال کے نظریۂ انقلاب سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اس نظم کے دو بند جو "سرمایہ و محنت" کے عنوان سے ہے، براہِ راست انقلاب روس اور اس کے پیغام سے متعلق ہیں۔ اس نظم میں اقبال نے انقلاب روس کو "نغمۂ بیداری جمہور" اور "آفتاب تازہ" سے تعبیر کیا ہے اور ساتھ میں سرمایہ داروں کے استحصالی کردار پر اپنے دلی کرب کا اظہار کیا ہے۔ اقبال کی نظر میں نسل و رنگ، سلطنت، تہذیب اور قومیت یورپ کے سامراجی ہتھکنڈوں میں شامل ہیں اور مغربی اقوام اپنے سامراجی منصوبوں کی تکمیل کیلئے ان عناصر کو بہت مؤثر خیال کرتی ہیں:

نسل، قومیت، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

اقبال مغربی سامراج کے سیاسی عزائم سے بخوبی آگاہ تھے۔ انھیں سرمایہ داروں کے اس طریقۂ کار سے سخت نفرت تھی کہ وہ تمام اخلاقی اور رحانی اقدار کو بالائے طاق رکھ کر عوام کے

---

[۱۱] عزیز احمد، اقبال، نئی تشکیل، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۰، ص ۳۰۲

[۱۲] سید مظفر حسین برنی (مرتب)، کلیات مکاتیب اقبال دوم، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۳، ص ۴۹۳

لوٹ کھسوٹ میں مصروف رہیں۔ جب وہ دنیا میں انسان اور اس کی روح کو پامال ہوتے دیکھتے ہیں تو انھیں اس کا دلی قلق ہوتا ہے اور یہ قلق ان کی شاعری میں انقلابی صورت میں ظاہر ہوتا ہے:

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اس لئے اقبالؔ محنت کش عوام اور مزدور کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتے ہوئے اسے عمل اور انقلاب کا پیغام دیتے ہیں:

ہمت عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ سا غافل تیرے دامن میں شبنم کب تلک
نغمۂ بیداریِ جمہور ہے سامانِ عیش
قصۂ خواب آورِ اسکندر و جم کب تلک
آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک
توڑ ڈالیں فطرتِ انسان نے زنجیریں تمام
دوریِ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک

اقبالؔ اس انقلاب کو انسانیت کے لئے اخلاقی نشاۃ ثانیہ کا مژدہ قرار دیتے ہیں کیونکہ اس انقلاب کے پیچھے جو اصول کارفرما تھا اور دنیا کے دبے کچلے انسانوں کو مغربی سامراج سے نجات دلانے کے لئے جو انقلابی بصیرت مضمر تھی، وہ اقبالؔ کو اپنے انقلابی تصور سے ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف اسے اپنی فکر کی اساس بنایا بلکہ پُر خلوص انداز میں انقلاب کے نغمے گائے اور بلا کسی رو رعایت کے اپنے انقلابی خیالات کا اظہار کیا۔ ''ساقی نامہ'' میں کہتے ہیں:

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ

پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

اقبال نے مغربی استعمار کی ریشہ دوانیوں اور جبر و بیداد کے حقائق کو بڑی بے باکی کے ساتھ اپنی فارسی اور اردو نظموں میں بے نقاب کیا ہے۔ ان کے انقلابی رویے میں غیر معمولی جرأت مندی کا اندازہ ان کی مشہور نظم "طلوع اسلام" سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس نظم میں اقبال نے مغربی سامراج کے داؤ پیچ اور اس کے سرمایہ دارانہ نظام کی تمام تر نزاکتوں کا طبقاتی کشمکش سے جائزہ لیا ہے:

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خرد مندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے

اس طرح "خضر راہ" سے انقلابی محرکات اقبال کے کلام میں اس قدر جاگزیں ہو جاتے ہیں کہ اس کے بعد سے لے کر "ارمغان حجاز" تک ان کی ساری شاعری اسی رنگ میں ڈوبی نظر آتی ہے۔ اس زمانے میں وہ اسلام کا اشتراکی تصور پیش کرتے ہیں۔ دراصل اقبال کی طبیعت جس ہمہ گیر انقلاب کی متمنی تھی، اس کی جھلک انھیں روسی انقلاب میں نظر آئی۔ ضرب کلیم کی ایک نظم "اشتراکیت" میں انہوں نے انقلابِ روس کو ایک اہم سیاسی تبدیلی قرار دیا ہے:

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیِ گفتار
اندیشہ ہوا شوخیِ افکار پہ مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنھیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار

انقلاب کا یہ تخریبی و تعمیری عمل بار بار "زبور عجم"، "پیام مشرق" اور اردو غزلوں میں جھلکتا ہے۔ اس موضوع پر پیام مشرق کی ایک نظم "نوائے مزدور" کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ یہ نظم اقبال نے اس وقت لکھی تھی جب انھوں نے خضر راہ لکھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ دونوں نظموں میں ایک سی امنگ، حوصلہ مندی اور جذبہ کارفرما ہے۔ اس نظم میں اقبال معاشرے کی نئی بنیادوں کو استوار کرنے کے لئے رہزنانِ چمن سے خونِ لالہ کا انتقام لینے کی بات کرتے ہیں:

زِ رہزنانِ چمن انتقامِ لالہ کشیم
بہ بزمِ غنچہ و گل طرحِ دیگر اندازیم
بطوف شمع چو پروانہ زیستن تا کے
زِ خویش ایں ہمہ بیگانہ زیستن تا کے

اقبال کے کلام میں مزدور اور محنت کش طبقہ کی حمایت کا ذکر بار بار ملتا ہے۔ انھیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ کس طرح ایک بڑا اور طاقتور طبقہ کمزور اور مفلوک الحال طبقے کو اپنے ظلم و جبر کا مشق بنائے ہوئے ہے۔ وہ اس استحصال کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بار بار مزدوروں اور محنت کش عوام کو اس بات کے لئے آگاہ کرتے ہیں کہ وہ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔ اس سلسلے میں بال جبریل کی ایک نظم "فرمانِ خدا فرشتوں سے" قابلِ توجہ ہے، جس میں اقبال کا انقلابی تصور زیادہ واضح ہو کر سامنے آتا ہے:

اٹھو! میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روٹی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اقبال کی فکر میں انقلاب کا جو تصور ہے وہ رومانی نہیں، بلکہ اخلاقی اور تعمیری ہے۔ اور اس کی بنیاد صالح اقدار پر قائم ہے۔ مزدوروں اور کسانوں کی مکمل آزادی کے بغیر اقبال کا تصور انقلاب ممکن نہیں۔ فرسودہ نظام کو مٹانے اور اس کی جگہ نئے نظامِ تہذیب کی تعمیر اقبال فطرت کا تقاضہ قرار دیتے ہیں۔ پیام مشرق میں ایک جگہ کہتے ہیں:

تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام
دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

اقبالؔ کی زندگی میں مغربی دنیا میں جو دوسرا اہم انقلاب رونما ہوا وہ اطالیہ میں مسولینی کی قیادت میں فسطائی انقلاب تھا۔ یہ انقلاب در حقیقت مغربی دنیا میں اشتراکیت اور جمہوریت کے خلاف ردّ عمل تھا۔ مسولینی نے نسلی تفوق اور قومیت کے جذبے کو ابھار کر اخوت و مساوات کو ٹھکرا دیا اور اپنے فلسفۂ فسطائیت کی رو سے سامراجیت پر عمل پیرا ہونے کو حق بجانب سمجھتا تھا۔ اقبالؔ نے اپنی نظم ”مسولینی“ (اپنے مشرقی و مغربی حریفوں سے) میں مسولینی کے اس جارحانہ عزائم اور اس کی سیاسی حکمت عملی کی کڑی تنقید کی ہے۔ اور اس کے شخصی کردار کی بعض خوبیوں کا اعتراف کرنے کے باوجود وہ فلسفہ فسطائیت کو سامراجی نظام کے ہم پلہ خیال کرتے ہیں۔ زیر تبصرہ نظم میں اقبالؔ نے مسولینی کی زبانی مغربی سامراج کی چیرہ دستیوں پر بھرپور وار کیا ہے:

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم
بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج
پردۂ تہذیب میں غارت گری، آدم کُشی
کل روا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج

تاہم اس انقلاب کے پسِ پشت اطالیہ میں انقلابی جذبے اور زندگی کی نئی حرارت کے جو آثار نظر آئے، اقبال اس کو بہ نظر استحسان دیکھتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک انقلاب اور تبدیلی کا عمل وہ جوہر ہے جو ایک قوم کو زندہ رکھنے اور اس کے اندر حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے۔

اقبالؔ دنیائے اسلام کے سیاسی مستقبل کے بارے میں فکر مند تھے۔ اس وقت عالم اسلام انقلابات کی زد پر تھا۔ بالخصوص ترکی اور ایران کو جس ابتلاء و آزمائش کے دور سے گذرنا پڑ رہا تھا، اقبال اس پر سخت رنجیدہ خاطر تھے۔ اقبالؔ روز ازل سے ایک درد مند دل لے کر آئے تھے۔ اس لئے اس عہد میں مسلمانوں کی زبوں حالی پر ملول ہونا، عالمی سطح پر مسلمانوں کی تذلیل و تحقیر سے ان کا غمگین ہونا بالکل فطری امر تھا۔ دریں حیثیت مسلمانوں کی معاشرتی و معاشی فلاح کے

ساتھ ان کے مذہبی تشخص، ان کے معاشی کردار اور تہذیبی حیثیت سے تحفظ کے لئے متفکر ہونا ناگزیر تھا۔ اس لئے اقبال ترکوں کی قومی جدوجہد سے ہمدردی رکھتے تھے اور اس بات پر خوش تھے کہ ترکوں نے انقلاب، ایثار اور حرکت و عمل کے ذریعے خود کو منضبط، مضبوط اور مستحکم کر لیا ہے۔ ایران میں رضا شاہ کی آمریت نے جو جمعیت پیدا کی، اسے بھی اقبال اصلاح و ترقی کی طرف ایک اہم قدم قرار دیتے ہیں۔ لیکن اقبال اسلامی ممالک میں ایسے انقلاب کے آرزومند تھے جو ملت اسلامیہ کو نہ صرف مغربی سیاست سے نجات دلائے بلکہ مغربی تہذیب و تمدن، مادیت جمہوریت اور وطینت سے مسلمانوں کو محفوظ رکھے۔ مصطفی کمال پاشا اور رضا شاہ نے اپنے وطن کو مغربی یلغار سے بچانے کے لئے جو اقدام اٹھائے تھے، اقبال اس کے رطب اللسان ہیں۔ تاہم اس کے بعض غیر دانشمندانہ عمل مثلاً دین کو سیاست سے علیحدہ کرنے اور خود کو مغربی تہذیب سے ہم آہنگ کے لئے جو لائحۂ عمل اختیار کیا تھا، اسکی شدید مذمت کرتے ہیں:

نہ مصطفی نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

اقبال پر بہت جلد یہ حقیقت آشکار ہو گئی تھی کہ ترکی و ایران میں مصطفی کمال اور رضا شاہ کی کوششوں سے سیکولرزم، الحاد اور مغرب زدگی کی جو فضا قائم ہو گئی ہے، وہ جذبۂ وطن پرستی کا نتیجہ ہے اور یہ بالکل وقتی چیز ہے۔ اس سے اسلام کی مضبوط بنیادوں کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتی۔ اپنے ان خیالات کا اظہار سید محمد سعید الدین جعفری کے نام ایک خط میں کیا ہے:

میرے نزدیک اسلام نوع انسانی کی اقوام کو جغرافیائی حدود سے بالا تر کرنے اور نسل و قومیت کی مصنوعی مگر ارتقاء انسانی کے ابتدائی مراحل میں مقید امتیازات مٹانے کا ایک عملی ذریعہ ہے۔ (۱۳)

پروفیسر اکبر منیر کے نام ایک خط میں اسلامی ممالک کے حوالے سے اقبال نے ایک ناگزیر انقلاب کی طرف اشارہ کیا ہے:

دنیا کے دل میں انقلاب ہے۔ اس واسطے قلوب انسانی اس سے متأثر ہو رہے ہیں۔ اسلام کی عظمت کا زمانہ انشاء اللہ قریب آرہا ہے۔ (۱۴)

---

(۱۳) سید مظفر حسین برنی (مرتب)۔ کلیات مکاتیب اقبال دوم، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۳، ص ۵۱۵

(۱۴) میاں محمد افضل، "اقبال اور عالمی سیاسیات"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۷۸، ص ۶۱، ۶۲

اقبالؔ کے فکر کا ایک دلچسپ انقلابی پہلو یہ ہے کہ وہ مسلم ممالک کے سیاسی مسائل کو اسلام سے وابستہ سمجھتے تھے اور ان کا یہ ایقان تھا کہ مسلم ممالک کے مسائل کا حل اسلام کی روشنی میں ممکن ہے۔ اس لئے وہ مسلم ممالک میں ایک ایسا انقلاب دیکھنا چاہتے تھے جو ان کو ایک مرکز پر مجتمع کر سکے۔ جمال الدین افغانی نے مسلم اتحاد کے لئے "عالمگیر اخوت اور پان اسلامزم" کی تحریک شروع کی تا کہ جمہوریت کی بنیاد پر تمام مسلم ممالک کو ایک مرکز پر لایا جاسکے، جن سے وہ متحد و منظم ہو کر مغرب کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا مقابلہ کر سکیں۔ اقبالؔ نے جمال الدین افغانی کی اس انقلابی جرأت کی بڑی تحسین کی ہے اور اپنی متعدد نظموں میں ان کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ مسلم ممالک کے حوالے سے جس انقلاب کا نقشہ اقبالؔ کے ذہن و تخیل میں ہے، اس کا اندازہ درج ذیل اشعار سے لگایا جاسکتا ہے:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر
نسل گر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گذر
تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

اقبالؔ کے مختلف ادوار کے اردو اور فارسی کلام نیز نثری تحریروں میں ان کی فکر کا یہ انقلابی پہلو نمایاں طور پر اثر انداز نظر آتا ہے۔ اقبالؔ ایک فلسفی اور مفکر کی حیثیت سے تاریخِ عالم سے کماحقہٗ واقفیت رکھتے تھے۔ فلسفۂ سیاسیات، انسانی تاریخ کے عروج و زوال کے اسباب و علل اور تجزیاتی علوم کی چھان ان کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہر اس انقلابی کوشش کو سراہا ہے، جس میں تہذیب اخلاق اور انسانیت پرور نصب العین پر زور دیا گیا ہے۔ اور ایسے مفکروں اور دانشوروں سے اپنی خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا ہے جن کا نام انقلاب یا انقلابی افکار وخیالات سے وابستہ تھا۔

فارسی زبان میں تاریخ نویسی: ہندوستانی مسلم مؤرخین کے حوالے سے

محمد ممتاز عالم
اسسٹنٹ پروفیسر، مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی، پٹنہ
mumtaz.alam48@gmail.com

دنیا میں جن زبانوں کو اپنی سرحدوں سے نکل کر دور دراز خطوں تک پھیلنے اور علمی، فنی، تاریخی، تدریسی اوراخلاقی قدروں کے امین ہونے کی سعادت ملی ہے فارسی ان میں سے ایک ہے۔ بالخصوص اسلامی فکر و فن اور تہذیب و ثقافت کا بہت بڑا سرمایہ اسی زبان میں محفوظ ہے۔ روایت، قدامت، شیرینی اور لطافت میں یہ زبان اپنی مثال آپ ہے۔ اسی کا ہی مقولہ ہے: زبان شیریں ملک گیری۔ شاید اسی وجہ سے اس زبان کے بولنے والے جس خطے میں گئے طویل زمانے تک جہانگیری سے مشرف رہے۔ فارسی بولنے والوں نے ایک طویل عرصے تک ہمارے ملک ہندوستان پر بھی رواداارانہ حکومت کی ہے۔ اس دور میں فارسی زبان نے خوب ترقی کی۔ بادشاہوں کے محل سے لے کر فقیر کی جھونپڑی تک بازار سے لے کر کورٹ کچہری تک اسی کی دھوم تھی۔

ہندوستان کو مختلف قوموں اور مذاہب کا مسکن ہونے کا شرف حاصل ہے اس لئے یہاں کی بولیاں بھی مختلف ہیں۔ یہاں جو بھی کارواں آیا ہے زبان کا تحفہ ضرور ساتھ لایا ہے۔ فارسی کی آمد بھی اسی طرح ہوئی ہے۔ اس بارے میں محققین مختلف الرائے ہیں کہ فارسی ہندوستان میں کب آئی؟ بعض کی رائے ہے کہ جب سے ہند و ایران کا تعلق قائم ہے تبھی سے فارسی زبان متعارف ہے۔ اس خیال کی تائید میں پنڈت برجموہن نے لفظ شاہی کو بطور گواہی پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد باقر نے پہلی یا دوسری صدی عیسوی میں ہی اس کی آمد کی خبر دی ہے۔ [1]

ان بحثوں سے یہ بات واضح ہے کہ یہ خطہ سیاسی اور تمدنی طور پر ایران سے متأثر رہا ہے لیکن جہاں تک فارسی زبان کی ہندوستان میں باقاعدہ آمد کا تعلق ہے تو وہ مسلمانوں کے ساتھ یہاں آئی۔ تمام مسلمان حملہ آور وسطی ایشیا اور ایران سے آئے۔ وہاں کے دربار علما اور فضلا کے مرکز

---

[1] ڈاکٹر ریاض وڈاکٹر صدیق شبلی، فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ، ایس ایچ آفسیٹ پریس دہلی ۲۰۱۱ء، ص ۱۵۰

تھے۔ جنگوں میں لشکر کے ساتھ علماو شعرائے دربار ہوتے تھے۔ ہندوستان کی فتح کے بعد ان میں سے اکثر یہاں رہ پڑے اور اس طرح ہندوستان میں فارسی ادب و شعر کی آبیاری شروع ہوئی(۲)

الغرض جو بھی ایرانی مسلمان کسی غرض سے یہاں وارد ہوا اس کے ساتھ فارسی زبان ضرور آئی خواہ وہ تاجر ہو یا مہاجر۔ اس شیریں زبان کو ہندوستان میں پھیلانے کی سعادت غزنویوں کے حصے میں آئی۔ اس دور میں بڑے بڑے صاحب کمال ہندوستان میں وارد ہوئے اور بہت سے یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان میں شعرا، ادبا، علما، صوفیا اور ہر کئی طرح کے ماہرین فن موجود تھے جنہوں نے فارسی زبان میں اخلاق، ادب، مذہب، تصوف اور کلام میں لازوال کارنامہ انجام دیا ہے لیکن اس دور میں تاریخ نگاری پر کوئی کتاب نہیں ملتی ہے۔ تاریخ دانوں کی رائے ہے کہ: فارسی زبان میں تاریخ نگاری کا آغاز عہد مملوک میں ہوا۔

اس فن کی اول کتاب ”بحر الانساب“ ہے۔ محمد مبارک شاہ معروف بہ فخر مدبر کی یہ کتاب ۶۰۲ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ان کے اصحاب، عرب کے حکمراں، شام و یمن کے سلاطین، شاہان عجم تک کے نسب کی مفید معلومات ہیں۔ یہ کتاب ”تاریخ فخر الدین مبارک شاہ“ کے نام سے بھی مطبوع ہوئی ہے۔

چچ نامہ ترجمہ ہے ”فتح نامہ“ یا ”منہاج الدین والملک“ یا ”تاریخ منہاج السالک“ کا۔ فارسی مترجم علی بن حامد بن ابی بکر الکوفی ہیں۔ وہ ناصر الدین قباچہ کے عہد میں ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور ۶۱۳ھ میں اس ترجمہ کے کام کو مکمل کیا۔ یہ کتاب ”فتح نامہ سندھ“ کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔ اس میں راجہ داہر کے احوال اور محمد بن قاسم کی فتوحات کا تفصیلی بیان ہے۔ سندھ کی تاریخ پر یہ مستند کتاب ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر T.Postans نے انگریزی میں اس کا اختصار کیا۔ مرزا قلیچ بیگ نے ۱۹۰۰ء میں اس کا مکمل ترجمہ کر کے شائع کروایا۔ اردو ترجمہ اختر رضوی نے کیا ہے۔ اس کے نام کے سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اصلی نام ”فتح نامہ“ ہے اور عرفی نام ”چچ نامہ“ ہے(۳)۔ یہ کتاب حکایت راجہ داہر سے شروع ہو کر محمد بن قاسم کی شہادت پر ختم ہوتی ہے۔ آخری جملہ ہے: ”محمد بن قاسم کا یہ دردناک انجام مرکزی سیاست کی تبدیلی اور نئے حکمرانوں

(۲) محمد عظیم الحق جنیدی، مآثر عجم، مکتبہ فانوس لاہور ۱۹۹۴ء، ص ۵۸

(۳) فارسی فتح نامہ سندھ ص ۱۸ برقی، سال و مطبع ندارد

کے جذبۂ انتقام کی وجہ سے ہوا جس کا داہر کی بیٹیوں کے من گھڑت افسانے سے کوئی تعلق نہیں''[۴]۔

لباب الالباب: اس کتاب کی تالیف عوفی نے کی ہے۔ اس کتاب میں ان سلاطین کی، جنہوں نے ملک گیری کے کارنامے انجام دیے ہیں، مہم جوئیوں کا احاطہ تو نہیں کیا گیا ہے البتہ جن سلاطین کو شعر کہنے سے رغبت رہی، خواہ انہوں نے زندگی میں ایک دو ہی شعر کیوں نہ کہے ہوں، ان کا تذکرہ ضرور کیا ہے۔ جب کہ بنیادی طور پر اس میں فارسی شعرا کے احوال مذکور ہیں۔ یہ کتاب ۳۷۰ شعرا کے احوال کا احاطہ کرتی ہے۔ عوفی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ مصنف مشہور صحابی عبد الرحمن بن عوف کی اولاد میں سے تھے۔[۵] اس کتاب کا پہلا باب فضیلت شعر و شاعری میں ہے اور پانچواں باب در لطائف اشعار سلاطین و ملوک و امرا ہے[۶]۔ ہندوستانی بادشاہوں میں پہلا نام محمود غزنوی کا ہے اور ان کے فارسی اشعار کے نمونے دیے گئے ہیں۔ سلاطین کی ادبی تاریخ میں یہ کتاب اہم ہے۔

تاج المآثر: یہ تاج الدین بن حسن نظامی نیشاپوری کی تصنیف ہے جو خراسان سے آکر دہلی میں فروکش ہوئے۔ قطب الدین ایبک نے ان سے اپنی فتوحات کے احوال پر ایک کتاب مرتب کرنے کی فرمائش کی جسے مصنف نے قبول کر لیا۔ بنیادی طور پر یہ کتاب قطب الدین ایبک کی فتوحات کی تاریخ ہے مگر اس میں سلطان شہاب الدین محمد غوری کے ہندوستان پر آخری پانچ حملے کی روداد اور التمش کے شروع کے سات سال کا بھی احاطہ ہے۔ اس کی معنویت نے مختلف زبانوں کے ماہرین کو اس کا ترجمہ کرنے پہ مجبور کر دیا۔ غوری کے آخری حملوں اور التمش کے ابتدائی سالوں پر شاید ہی کوئی تحریر ہو جس میں اس کتاب سے استفادہ نہ کیا گیا ہو۔

طبقات ناصری: سلطان ناصر الدین کے نام سے معنون یہ تاریخ ابو عمر عثمان بن منہاج سراج جرجانی (جرجانی اور جوزجانی دونوں نسبت کشف الظنون میں ہے)[۷] کے رشحات قلم کا شاہکار

---

[۴] چچ نامہ ص ۳۴۴، سندھیکا اکیڈمی کراچی اختر رضوی ۲۰۰۸ء

[۵] محمد بن محمد عوفی، لباب الالباب، مقدمہ از محمد بن عبد الوہاب قزوینی، ای۔ جے بریل لیڈن ہالینڈ، ۱۹۰۳، ص: ۷ام

[۶] ماخذ سابق ص ۹۔

[۷] حاجی خلیفہ، کشف الظنون، داراحیاتراث الاسلامی بیروت لبنان، ۱۹۴۱، جلد دوم ص: ۱۱۰۷

ہے۔ مصنف کا علمی مقام بلند تھا۔ مذہبی علوم میں منفرد تھے اور ملک کے قاضی القضاۃ رہ چکے تھے۔ اس کتاب میں دنیا کی ابتدا سے لے کر ۶۵۸ھ تک کے واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا سب سے مفید حصہ غوریوں سے لے کر مصنف کے دور تک کے حالات کا بیان ہے۔ اندازِ تحریر خوب ہے۔ قاری الجھے بغیر اصل واقعے سے واقف ہو جاتا ہے۔ جگہ جگہ اشعار سے باتوں کی تکمیل نے کتاب کو اور پر لطف بنا دیا ہے۔ اس میں موقع محل کی مناسبت سے اشعار لکھے گئے ہیں لیکن خلجی اور تغلق کے دور میں منظوم فارسی تاریخ نگاری کا بھی آغاز ہو گیا تھا۔ اس کی ابتدا اس دور کے ممتاز شاعر طوطی ہند امیر خسرو نے کیا۔ انہوں نے معزالدین کیقباد اور بغرا خان کے درمیان ہونے والی صلح کو شعری پیرایہ میں بیان کیا۔ جلال الدین خلجی کے بیٹے خضر خان کی دولرانی کے ساتھ معاشقہ اور شادی کو بھی منظوم شکل دی۔ "قران السعدین" اور "دولرانی خضر خاں" نامی یہ مثنویاں فارسی زبان و ادب اور تاریخ ہند سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مفید ہیں۔ امیر خسرو کے علاوہ "فتوح السلاطین" میں خواجہ عبد الملک عصامی نے بھی غزنوی دور سے لے کر ۱۳۵۰ھ تک کے واقعات کو منظوم قلمبند کیا ہے۔ امیر خسرو نے منظوم کے علاوہ منثور تاریخ بھی لکھی ہے جس کا نام "خزائن الفتوح" ہے۔ یہ علاء الدین خلجی کے دور کی تاریخ ہے اس لئے اسے "تاریخ علائی" کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔[۸] اس دور کی مختصر ترین تاریخ "تغلق نامہ" ہے۔ یہ سلطان محمد تغلق کی تحریر کردہ تاریخ ہے اس کا کچھ حصہ طبقات ناصری کے ساتھ مطبوع ہوتا رہا ہے۔ "تغلق نامہ" امیر خسرو نے بھی لکھا ہے مگر وہ تاریخ نہیں مثنوی ہے۔

تاریخ فیروز شاہی: اس دور میں تاریخ نگاری میں بلند پایہ نام ضیاء الدین برنی کا ہے۔ انہوں نے عنایت نامہ، مآثر سادات، حسرت نامہ اور دوسری کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی سب سے مشہور کتاب "تاریخ فیروز شاہی" ہے جس کے تعلق سے کہا گیا ہے: "تاریخ فیروز شاہی اصل میں طبقات ناصری کا تکملہ ہے اور اس میں خاندان غلامان کے سلطان بلبن کی تخت نشینی ۶۶۴ھ سے سلطان فیروز شاہ تغلق کے چھٹے سال جلوس ۷۵۸ھ تک کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب

---

[۸] ماخذ سابق، ص ۸۹۲

"طبقات ناصری" سے کہیں زیادہ دلچسپ، شگفتہ اور معلوماتی ہے۔[۹] یہ کتاب برنی کے نظریۂ تاریخ نگاری کا ترجمان ہے جس میں واقعات کے عواقب و انجام اور سلاطین کی مدح کے بجائے ان کے کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کشف الظنون میں اس کا نام تاریخ فیروز شاہ لکھا ہے[۱۰]۔ برنی نے "اخبار بر مکیاں" کے نام سے ابو القاسم محمد طائفی کی تاریخ کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ تاریخ فیروز شاہی کے نام سے شمس سراج عفیف نے ایک تاریخ مرتب کیا ہے۔

سید اور لودی خاندان کے دور کی فارسی تاریخیں

تاریخ مبارک شاہی: اس دور کی تاریخ میں ایک اہم کتاب "تاریخ مبارک شاہی" ہے جسے یحیٰ بن احمد بن عبد اللہ سرہندی نے تالیف کیا ہے اس میں شہاب الدین غوری سے لے کر سید سلطان محمد کے زمانے تک کے حالات مذکور ہیں۔ یہ سید خاندان کے بارے میں معلومات فراہم کرنے والی اہم کتاب ہے۔ تاریخ مبارک شاہی کے نام سے ایک تاریخ معین الدین ہروی کی بھی فارسی زبان میں ہے۔[۱۱]

مآثر محمود شاہی: اس کتاب کے مصنف علی بن محمود کرمانی ہیں جن کا لقب شہاب حکیم تھا۔ یہ کتاب سلطان محمود خلجی کے عہد کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔ پر تکلف اندازِ تحریر ہے۔

طبقات محمود شاہیہ: یہ نو طبقات پر مشتمل فارسی تاریخ ہے جس کے ہر طبقے میں ایک صدی کے احوال کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کے فاتحہ میں رسول اللہؐ کا ذکر جمیل ہے۔ اس کتاب کی فرمائش مصنف سے محمود شاہ بیکڑا گجراتی نے کیا تھا جسے مصنف نے قبول کر لیا تھا اور انہیں کے نام پر اس کا نام "طبقات محمود شاہیہ" رکھا گیا۔

تاریخ ناصری یا ناصر شاہی: مالوہ کے بادشاہ سلطان ناصر الدین کے عہد حکومت کے معلومات پر مشتمل کتاب ہے۔

---

[۹] فارسی زبان کی مختصر ترین تاریخ، ص۱۷۷، ڈاکٹر ریاض و ڈاکٹر صدیق شبلی، فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ، ایس ایچ آفسیٹ پریس دہلی ۲۰۱۱ء

[۱۰] کشف الظنون، ص۲۹۹

[۱۱] ماخذ سابق، ص۳۰۲

مغلیہ عہد کو ہندوستان میں فارسی زبان کا عہد زرین کہا جاتا ہے۔ اس دور کی تاریخ کی ایک ایک کتاب موضوع تحقیق کے لائق ہے اور کئی کتابوں پر تحقیق بھی ہو چکی ہے۔ اس دور کے متعلق تمام تر معلومات فارسی زبان میں قلمبند ہے۔ اس دور پر کوئی قابل داد تحقیق فارسی زبان سے آشنائی کے بغیر مشکل ہے۔ اس دور کی تاریخی کتابوں میں ایک اہم کتاب "ہمایوں نامہ" ہے جسے ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم نے تحریر کیا ہے۔ اس میں اندرون حرم کی کہانی خود محل کی خاتون کی زبانی لکھی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اندرونی احوال پر اس سے بہتر شائد کوئی کتاب ہو۔ یہ کتاب جہاں گلبدن کی قابلیت کی دلیل ہے وہیں بہت سے اعتراضات کا جواب بھی ہے۔ گلبدن بڑی قابل اور عالم خاتون تھیں۔ عہد مغلیہ کی مشہور خواتین کا سلسلہ انہیں سے شروع ہوا اور جس طرح چاند بی بی، نور جہاں، جہاں آرا اور زیب النسا کی قابلیت اور اثر واقتدار سے عیسائی مؤرخین کا یہ اعتراض غلط ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں مستورات کو جائز درجہ نہیں دیا جاتا اسی طرح گلبدن بیگم کی علمیت اور زہد وتقوی بھی قوم اور ملک کے لئے باعث فخر ہے[۱۲]

تاریخ رشیدی: منگول اور برصغیر کی تاریخ پر یہ یاد داشت تحریر میرزا حیرت دوغلت کی ہے جو ہمایوں کا خالہ زاد بھائی تھا۔

نفائس المآثر: یہ میر علاء الدولہ کامی قزوینی کی تالیف ہے۔ اس کتاب کے اقتباسات کو عبد القادر بدایونی نے اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے۔

تاریخ ہمایوں: بایزید بیات کی تصنیف ہے جو ہمایوں اور اکبر کے عہد پر روشنی ڈالتی ہے۔

اکبر نامہ اور آئین اکبری: مغلیہ عہد کی مشہور تاریخ ہے جسے ابو الفضل علامی نے مرتب کیا ہے۔ کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا ہے۔ یہ کتاب تاریخ نویسی کے نئے ذرائع اختیار کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔[۱۳]

تاریخ اکبری: اکبر کے عہد کی تاریخ ہے جسے محمد عارف قندھاری نے تالیف کیا ہے۔ اس دور پر ایک کتاب "اکبر نامہ" بھی ہے جو اکبر کے عہد کو سمجھنے میں مفید ہے۔ اس کے مؤلف شیخ الہ داد

---

[۱۲] شیخ اکرام، رود کوثر، مطبع جدید پریس لاہور ۲۰۰۵ء، ص ۱۶۵

[۱۳] رود کوثر، ص ۱۶۵

فیضی سرہندی ہیں۔ ایک دوسرا "اکبرنامہ" اسد بیگ نے بھی تالیف کیا ہے۔ شیخ اکرام نے اسے عہد اکبری کے عینی مؤرخوں میں شمار کیا ہے[۱۴]

مآثر رحیمی: یہ کتاب عبد الرحیم خان خاناں اور ان کے معاصر بیرم خان اور دیگر افراد کے حالات پر مشتمل ہے جسے خواجہ عبد الباقی نہاوندی نے تالیف کیا ہے۔ اس میں اس وقت کے ہندوستان کی تاریخ خوش اسلوبی سے بیان کی گئی ہے۔

منتخب التواریخ: یہ مغلیہ عہد کی مشہور تاریخ ہے جو اکبر کے زمانے میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں اس عہد کی معاشرت، شخصیات، مذہب و مشرب اور اس کے بدعات و خرافات پر بے لاگ تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس تاریخ کی خوبی یہ ہے یہ کتاب اس زمانے کی مذہبی معلومات فراہم کرتی ہے۔[۱۵]

تاریخ الفی: یہ مغلیہ عہد میں لکھی جانے والی مفصل ترین تاریخ ہے جسے کئی مؤلفین نے مل کر ترتیب دیا ہے اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر ۱۵۸۸ء تک کے احوال اس میں تحریر ہیں۔

طبقات اکبری: خواجہ نظام الدین احمد (م:۱۵۹۴) کی تصنیف ہے۔ اس کا دوسرا نام تاریخ نظامی اور طبقات اکبری شاہی بھی ہے اس میں دہلی، دکن، گجرات، بنگال، جونپور، کشمیر سندھ اور ملتان کی تاریخ ہے۔

علوم حدیث کی مشہور شخصیت شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے بھی فارسی زبان میں ایک تاریخ "تاریخ حقی" یا "ذکر الملوک" کے عنوان سے لکھی ہے۔ اس میں معز الدین سام سے لے کر اکبر کے زمانے تک کی تاریخ تفصیل سے مذکور ہے۔ اولیاء اللہ کی سوانحی تاریخ "اخبار الاخیار فی اسرار الابرار" نام سے انہوں نے لکھی ہے۔ ارباب علم کے نزدیک اہل دل سے واقفیت کے لئے یہ کتاب بڑی مفید ہے۔ تاریخی حقی کے طرز پر "زبدۃ التواریخ" نور الحق المشرقی نے مرتب کیا ہے اس میں جہانگیر کے عہد تک کے حالات ہیں۔

تاریخ سندھ: فارسی زبان میں اسلام کی آمد سے لے کر اکبری عہد تک کے احوال سندھ پر مشتمل

---

[۱۴] شیخ اکرام، رود کوثر، لاہور ۲۰۰۵ء، ص ۱۱۲

[۱۵] شیخ اکرام، رود کوثر، لاہور ۲۰۰۵ء، ص ۱۱۴

یہ کتاب سید محمد معصوم کی تصنیف ہے۔ چچ نامہ کے بعد سندھ کی تاریخ پر یہ مستقل کتاب ہے۔

توزک جہانگیری: شہنشاہ سلیم نورالدین جہانگیر کی تصنیف ہے۔ اس میں مختلف پہلوؤں پر خود شاہ وقت نے روشنی ڈالی ہے۔ یہ اس دور کی حالت ہی نہیں بادشاہ کی علمی رغبت کا بھی ترجمان ہے۔

گلشن ابراہیمی یا تاریخ فرشتہ: یہ مشہور کتاب میر قاسم ہندو شاہ فرشتہ استر آبادی کی تصنیف ہے۔ اس میں تاریخ کو تفصیل سے تحریر کیا گیا ہے۔ اس میں عہد قدیم سے لے کر اس دور کے ہندوستان کی سیاسی مذہبی علمی اور فکری تاریخ دستیاب ہے۔

بہارستان شاہی: اس کا مصنف نامعلوم ہے۔ اس میں کشمیر کے حالات درج ہیں اور ساتھ ہی عہد جہانگیری کے ۱۶۱۴ء تک کے احوال کو قلمبند کیا گیا ہے۔ کشمیر کی تاریخ پر ایک اور کتاب حیدر ملک کی ہے جس کا نام ”تاریخ کشمیر“ یا ”تاریخ حیدر ملک“ ہے اس میں ابتدا سے عہد اکبری تک کے احوال لکھے گئے ہیں۔

پادشاہ نامہ یا شاہ جہاں نامہ: یہ کتاب محمد امین قزوینی کی تحریر کردہ ہے۔ اس میں عہد شاہجہاں پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ پادشاہ نامہ تین جلدوں میں دستیاب ہے جس کی دو جلدیں عبدالحمید نے لکھی ہیں اور تیسری جلد ان کے شاگرد محمد وارث کی تصنیف کردہ ہے۔ اس میں عینی مشاہدات پر مبنی سیاسی اور معاشرتی احول تحریر کئے گئے ہیں۔ عہد شاہجہاں کے احوال پر ایک کتاب ”عمل صالح“ محمد صالح کنبوہ لاہوری کی ہے۔ عہد شاہجہانی کی ترجمان کتابوں میں ”صبح صادق“ بھی ہے جس کو مرزا محمد صادق صادقی نے تالیف کیا ہے۔ اس کی پہلی دو جلدیں شاہجہاں کے عہد تک کی اسلامی تاریخ، تیسری جلد علماء و فضلاء کے احوال اور چوتھی جلد اسلامی ممالک کے جغرافیہ پر مشتمل ہے۔

علما اور صوفیا کے احوال پر مشتمل کتابوں میں ہاشم بدخشانی کی ”زبدۃ المقامات یا برکات الاحمدیۃ الباقیہ“ ہے۔ شیخ سرہندی کے حالات پر ”مجمع الاولیا“ مؤلف میر اکبر علی اردستانی، پندرہ سو اولیا کے حالات پر محیط ”حضرات القدس“ مؤلف شیخ بدرالدین سرہندی، نقشبندی سلسلے کے صوفیہ کے احوال پر ”مخبر الواصلین“ مؤلف میر محمد فاضل اکبر آبادی، منظوم احوال عرفا ”ذخیرۃ الخوانین و عرصۃ العاشقین“ مؤلف تقی اوحدی، تین ہزار عارفین کے تذکرے ”مجمع النفائس“ مؤلف سراج الدین علی خاں آرزو اکبر آبادی۔

شعرا کے تذکرے پر محیط صمصام الدولہ کی تصنیف "مآثر الامرا"، جوہر آفتابچی کی "تذکرۃ الواقعات"، خافی خان کی "منتخب اللباب"، اسلم پسروری کی "فرحۃ الناظرین"، محمد اعظم دیدہ مری کی "واقعات کشمیر یا تاریخ عظمی"، غلام حسین طباطبائی کی "سیر المتأخرین"، میر غلام علی آزاد بلگرامی کی "مآثر الکرام"، محمد صادق کشمیری کی "طبقات شاہجہانی"، محمد اسلم منعمی کی "گوہر عالم"، مرزا غالب کی "مہر نیمروز" وقیع کتابوں میں شامل ہیں۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد فارسی کا زوال بھی شروع ہو گیا اور فارسی کی جگہ انگریزی نے لے لی۔ اس دور کی تاریخ میں اہم "تاریخ جید" یا "خلافت نامہ" ہے جسے ملا احمد سہروردی کشمیری نے منظوم لکھا ہے۔ اس کتاب میں اسلامی تاریخ کے اہم واقعات کو شعری پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کا سن تالیف ۱۸۶۷ء ہے۔ "جونپور نامہ" خیر الدین محمد الہ آبادی نے جونپور کی تاریخ پر ۱۸۹۶ء میں لکھا ہے۔ "تاریخ دکن" عبد العلیم محمد نصر اللہ خان قمر نے ترتیب دیا ہے۔ اودھ کی تاریخ "وزیر نامہ" نواب امیر علی بہادر نے تالیف کیا ہے۔ "لب تاریخ" سندھ کی تاریخ بیسویں صدی کے آغاز تک خاں بہادر خداداد خان نے تالیف کیا۔ اس دور میں سر سید احمد خاں نے "جام جم" فارسی میں تحریر کیا ہے جس میں خاندان مغلیہ اور تیموریہ کی تاریخ ہے۔ یہ کتاب سر سید کی پہلی تالیف مانی جاتی ہے۔

"تاریخ حسن" پیر غلام حسن کھویہامی نے لکھا ہے۔ اس میں چار جلدوں میں کشمیر کے احوال قلمبند ہیں۔ کشمیر کی ایک اہم تاریخ اس دور میں "تاریخ کبیر" کے نام سے لکھی گئی ہے جس کے مصنف محمد محی الدین مسکین ہیں۔

فارسی ہندوستان میں آکر علم وفن کی زبان کی حیثیت اختیار کر گئی۔ کیا ہندو کیا مسلمان سب نے اس زبان کو اپنایا اس میں تصنیف و تالیف کا کام انجام دیا۔ جب تک یہ دفتری زبان رہی اس خطہ میں مروج تمام علوم وفنون کی کتابیں فارسی میں لکھی جاتی رہیں۔ بالخصوص ادب میں اس کے شہ پارے ناقابل فراموش ہیں۔ تاریخ میں اس کا دامن متنوع لعل و گہر سے بھرا ہے آج بھی اس ملک کی دینی اور عصری درسگاہوں میں اس کی تعلیم ہوتی ہے۔ دانشگاہوں میں اعلی ڈگری کا اہتمام ہے۔

ٹیپو کا معاشرتی انصاف اور باہمی اتحاد کی پالیسی

کلیم صفات اصلاحی
رفیق دارالمصنّفین، اعظم گڑھ
kaleemsefatislahi@gmail.com

تاریخ کے طالب علم کو یہ بات بہت واضح طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ اگر انگریزوں نے باقاعدہ سیاسی سازش کے تحت ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کے خلاف برادران وطن کے ذہن و دماغ میں نفرت، حقارت اور عداوت کا بیج نہ بویا ہوتا تو ہندوستانی مسلمانوں کو آج وہ دن نہ دیکھنا پڑتا جس سے وہ روبرو ہیں۔ جس گھن، تعصب، تنگ نظری، کم ظرفی، مخاصمت اور معاشرتی بائیکاٹ کے ماحول کا آج کا مسلمان نہایت صبر واستقامت سے سامنا کر رہا ہے اس کے پیچھے انگریزوں اور ان کے توسط سے پھیلائے گئے من گھڑت اور جعلی مواد کا پورا کردار ہے۔ مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ برطانوی اقتدار نے فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کا باقاعدہ منصوبہ بنایا تھا۔ ماڈرن اسلام ان انڈیا میں ایک انگریز گورنر جنرل کا یہ قول موجود ہے کہ "میں اس خیال سے غافل نہیں ہو سکتا کہ مسلمان بنیادی طور پر ہمارے دشمن ہیں اور ہماری پالیسی ہندوؤں کو اپنے ساتھ ملانے پر مبنی ہے"۔[۱] اسی کتاب میں کرنل جان کاک کی یہ پالیسی بھی لکھی گئی ہے کہ "ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ یہاں مذہبی فرقوں میں علاحدگی کے جہاں جہاں بھی امکانات ہیں انہیں پوری قوت سے زندہ رکھیں، نہ کہ ختم کرائیں"۔[۲] جان اسٹریچی کا خیال تھا کہ "ہندوستانی عوام میں ساتھ ہی ساتھ، مذہب کے اختلافات ہماری سیاسی پوزیشن کے لیے بہت مضبوط بنیاد ہے"۔[۳] یہ اور اس طرح کے بے شمار

---

[۱] ہم نے یہ حوالہ سید خورشید صاحب کی کتاب سے نقل کیا ہے۔ انٹرنیٹ پر ماڈرن اسلام ان انڈیا، مطبوعہ ۱۹۴۶ء کا جو نسخہ پی ڈی ایف میں ملا ہے اس میں اس صفحہ پر یہ عبارت نہیں ہے۔ اس لیے اس انگریز گورنر جنرل کا نام معلوم نہ ہو سکا۔

[۲] اسمتھ ڈبلیو، ماڈرن اسلام ان انڈیا، ص ۱۸۹-۱۹۰، بحوالہ سید خورشید مصطفی رضوی، شیر ہندوستان، ٹیپو سلطان چند تاریخی حقائق، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی ۲۰۱۲ء ص ۱۸۔

[۳] کا پلینڈ، انڈین پرابلم، حصہ ۱، ص ۳۵، بحوالہ ماخذ سابق

اقوال و نظریات انگریزوں کی کتابوں میں موجود ہیں جن کو ہندوستانیوں کی اچھی خاصی تعداد نے حقیقت سمجھ کر پڑھا اور موجودہ نسل بھی اس سے فیض یاب ہو رہی ہے اور ان ہی خطوط پر انگریزوں کے بنائے ہوئے نقشے کے مطابق عام ہندوستانیوں کے فکر و مزاج کی آبیاری ایک مدت سے کی جارہی ہے جس کے اثرات و نتائج ہمارے سامنے کھل کر آرہے ہیں۔

انہوں نے حد تو یہاں تک کر دی کہ مسلم دشمنی کو نہایت چالاکی سے مذہب اور تعلیم سے جوڑ کر اس کو ہندو مسلم فرقہ پرستی کا حصہ بنا دیا۔ ان ہی انگریزوں کی تصانیف سے غذا پا کر بعد میں فرقہ وارانہ ذہنیت کے افراد اپنے مذموم مقاصد کے حصول میں سرگرم اور ان کی سازشوں کا آلہ کار ہوگئے۔ آج مذہبی اور عصری تعلیمی اداروں میں تاریخ ہند سے متعلق جو کتابیں نصاب میں شامل ہیں ان کا اہم ماخذ انگریزوں کی تصنیف کردہ کتابیں ہیں جن میں کہیں نہ کہیں ایسے ابواب پڑھائے جاتے ہیں جن سے دونوں قوموں میں اتحاد و اتفاق کے ساتھ مل جل کر رہنے کے بجائے دوری پیدا ہو۔ دونوں قوموں میں شہری و تمدنی ہم آہنگی کی نشو و نما اور گنگا جمنی تہذیب کی فضا کا استوار ہونا بھی دشوار نظر آرہا ہے۔ مذہبی عصبیت کے تار و پود اس قدر مضبوطی سے بنے گئے ہیں کہ دونوں قومیں ظلم کے خلاف ایک پلیٹ فارم پر بڑی مشکل سے آپا رہی ہیں کہ مظلوموں کو ان کا حق دلانے میں مثبت کردار ادا کر سکیں۔

متعصب انگریزوں سے بہت بہتر کتابیں خود ہمارے غیر مسلم ہندو دانشوروں نے تصنیف کی ہیں جن سے بھائی چارگی، ملنساری اور امن و عافیت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، اس لیے ان کتابوں کے بجائے ہمارے ملک کے بیدار مغز محققین و مورخین کی کتابوں کو نصاب کا حصہ بنانے کی ضرورت ہے۔ بشمبر ناتھ پانڈے اور این سکسینہ وغیرہ نے تاریخ ہند سے متعلق انگریزوں کے ذریعہ تیار کردہ مواد کے بارے میں اپنی تحریروں اور تقریروں میں بہت پہلے ہوشیار کر دیا تھا۔ سکسینہ کے بقول اسکولوں میں تاریخ کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں یا ہندی میں جو کتابیں کورس میں داخل ہیں وہ نسلی اور فرقہ وارانہ تعصب سے بھری ہوئی ہیں۔ بی، این پانڈے ۲۹ جولائی ۱۹۷۷ء کو راجیہ سبھا میں کہتے ہیں کہ انگریز مؤرخوں اور استادوں نے جو کچھ پڑھایا اس کے اثرات ہم اب تک دور نہیں کر سکے۔ ایسی تاریخوں سے جو تاثرات پیدا ہوتے ہیں وہ ہماری قومی زندگی کو آلودہ کیے ہوئے

ہیں[۴]۔

انگریزوں نے جن مسلمان حکمرانوں کو بدنام کیا ان میں ٹیپو سلطان (۱۷۵۰- ۱۷۹۹ء) کا نام سر فہرست ہے۔ مشہور دانشور اور مؤرخ بشمبر ناتھ پانڈے نے لکھا ہے کہ انہوں نے نصاب میں شامل کچھ طلبہ کے پاس ہر پرشاد شاستری کی کتاب دیکھی جس میں لکھا تھا کہ "تین ہزار برہمنوں نے خودکشی کرلی کیوں کہ ٹیپو انہیں زبردستی مسلمان بنانا چاہتا تھا"۔ جب مصنف سے اس کے ماخذ کے متعلق بذریعہ خط پوچھا تو انہوں نے میسور گزیٹیر کا حوالہ دیا تو اس کے ایڈیٹر سری کانتیا سے رابطہ کیا گیا تو کانتیا نے پانڈے صاحب کو لکھا کہ اس میں ایسا کوئی واقعہ درج نہیں ہے۔ انہوں نے ٹیپو کے وزیر اعظم اور سپہ سالار وغیرہ کے نام لکھے جو سب کے سب ہندو تھے اور یہ بھی لکھا کہ ٹیپو ۱۵۶ مندروں کو سالانہ امداد اور وظیفہ وغیرہ دیتا تھا۔ انہوں نے ٹیپو کے تیس خطوں کی نقلیں بھی بھیجیں جو سری نگیری کے جگد گرو شنکر آچاریہ کے نام ٹیپو نے لکھے تھے۔ پانڈے صاحب کے لکھنے پر بنگال گورنمنٹ نے یہ کتاب کورس سے خارج کر دی[۵]۔

ایک بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہماری مسخ شدہ تاریخ کے زہریلے اثرات کو روکا جائے جو ہمارے جوان دماغوں میں بھر دیے گئے ہیں۔ بہت سے مسخ شدہ نظریات ہیں جو جان بوجھ کر انگریزوں نے ہماری تاریخ میں لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی کے تحت بھر دیے ہیں اور آج بھی ہمارے دماغوں کو زہریلا بنائے ہوئے ہیں۔ وقت کا بڑا ہی اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ ہماری تاریخ کی کتابوں کو دوبارہ صحیح طریقے سے مرتب کیا جائے۔ ورنہ فرقہ وارانہ طاقتیں اسی طرح کی بگڑی ہوئی صورتحال کا فائدہ اٹھاتی رہیں گی[۶]۔

یہ اور اس طرح کے مضامین کا ہمارے ملک کی تعلیمی پالیسیوں پر کس قدر اثر پڑا، اس کا تجزیہ الگ سے مطالعے کا متقاضی ہے۔ بادی النظر میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس قسم کے مثبت خیالات و نظریات پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ اگر ان کا خاطر خواہ نوٹس فوراً لیا گیا ہوتا تو ملک کی اکثریت بالخصوص سیاسی شخصیات کے دلوں میں مسلمانوں سے نسبت کی تقریباً ہر چیز

---

[۴] بحوالہ شیر ہندوستان ٹیپو سلطان، چند تاریخی حقائق، ص ۱۳

[۵] بشمبر ناتھ پانڈے، اسلام اینڈ انڈین کلچر، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۸۷ء، ص ۳۳-۳۴

[۶] ہندوستان ٹائمز، ۲۱ فروری ۱۹۸۶ء، بحوالہ شیر ہندوستان، ٹیپو سلطان چند تاریخی حقائق ص ۱۲

کھٹکتی نہیں اور تاریخ کے صفحات سے ان کے نام کھرچ کھرچ کر صاف نہیں کیے جارہے ہوتے۔ ٹیپو کے ساتھ بھی یہی کیا جارہاہے اور اس کی بھی تصویر ملک و قوم کے سامنے بگاڑ کر پیش کی جارہی ہے۔

ٹیپو بھی انہیں ان مظلوم حکمرانوں میں ہے جو ہندو دوستی، جمہوریت نوازی، مساوات، باہمی اتحاد، رواداری، روشن خیالی، سوشل جسٹس اور غیرمسلموں سے ہمدردانہ و غیر متعصبانہ تعلقات کے باوجود بعض سخت گیر اور متعصب مؤرخوں کی دسیسہ کاریوں کا شکار ہے۔ حالانکہ مثبت واقعات سے اس کی زندگی کی پوری تاریخ بھری پڑی ہے۔

جب اس مسئلہ پر غور کیا جائے گا تو یقیناً یہ بات سامنے آئے گی کہ اس وقت مسلمانوں کے ہاتھ میں حکومت تھی۔ اس وقت کے حالات کچھ اور تھے، آج کے کچھ اور ہیں۔ ٹیپو اور اس کی ہندو مسلم رعایا نے مل کر ایک غیر ملکی قابض وغاصب حکومت سے جنگ کی تھی۔ اس وقت کی فضا ہندو مسلم اتحاد کے مانوس نعروں سے گونجتی تھی۔ ٹیپو کے پاس دشمنوں سے جنگ کے لیے فوجی طاقت تھی۔ اس کی فوج میں ہندوستان کی تمام قومیں شامل تھیں۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا ہر طرف بول بالا تھا۔ غیر جانب دارانہ اور منصفانہ ماحول میں لوگ جی رہے تھے۔ ٹیپو نے اس ملک کو بنانے، سجانے، سنوارنے اور اختلاف سے بچا کر انگریز غاصبوں کے خلاف اس کے باشندوں کو متحد کرنے میں اپنا خون پسینہ ایک کیا تھا۔

آج کے مسلمانوں کے پاس تعلیم وتعلم سے شغف، حسن اخلاق، مصلحت اور حکمت آمیز رویہ، روادارانہ برتاؤ، ہر قسم کے حالات کے مقابلے کے لیے صبر و عزیمت، باہمی اتحاد اور سب سے بڑھ کر توکل علی اللہ کی دولت کے سوا ظاہری اسباب میں کچھ بھی نہیں ہے۔ یہی وہ دولت اور ہتھیار ہے جن سے مسلمانوں نے قوموں کا دل پہلے بھی جیتا تھا اور آج بھی اسی سے کام لے کر وہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔ ٹیپو کی فتح و کامرانی کا اصل راز بھی یہی تھا۔

ٹیپو کے سوانح حیات اور ملک و قوم کے تئیں اس کے نظریات کے مطالعے سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ وہ انگریزوں کے خلاف اتحاد باہمی کا سب سے پہلا نقیب تھا۔ وہ انتہائی غیر جانب دار حکمراں تھا۔ اس نے ہندو مسلم امرا و حکام اور عام رعایا میں تفریق نہیں کی۔ اس کے اسی جذبے اور پالیسی نے تمام ہندوستانی اقوام میں اس کو زبردست مقبولیت عطا کی تھی۔ انگریزوں

کے خلاف اس کا یہ نعرہ " انگریزو! نکل جاؤ۔ ہندوستان صرف ہندوستانیوں کے لیے ہے"۔(۷) اس کی اتحاد باہمی کی پالیسی کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔ اس جملے سے جہاں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ٹیپو انگریزوں کے ہندوستان پر قبضہ و تسلط کو ناجائز سمجھتا تھا وہیں وطن عزیز اور اس کے باشندوں سے اس کی بے پناہ محبت کا علم بھی ہوتا ہے۔ ٹیپو کی کوئی بھی پالیسی جانب داری یا صرف مسلم دوستی پر مبنی نہیں ہوتی تھی۔ اس کی ہر پالیسی اتحاد و یگانگت، قومی یکجہتی اور معاشرتی انصاف کی آئینہ دار تھی۔ اس پالیسی نے اس کے مزاج میں جمہوریت اور رواداری کو شامل کر دیا تھا۔

ٹیپو کا جمہوری طرز حکومت: جمہوریت بحیثیت مجموعی ایسا نظام حکومت ہے جس میں عوام کی رائے کو کسی نہ کسی شکل میں حکومت کی پالیسیاں طے کرنے کے لیے بنیاد بنایا گیا ہو۔ آمریت کے برخلاف اس طرز حکمرانی میں تمام فیصلے عوامی نمائندے کرتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے عہد کی جمہوریت کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا تھا۔ جمہوریت کے علم بردار ممالک میں جمہوریت کے اقدار کی صورت حال ان کے سامنے تھی۔ اپنے اس مطالعے کے نتیجے میں انہوں نے جمہوریت کو ایک ایسے طرز حکومت سے تعبیر کیا ہے جس کے مطابق جمہوریت میں سر گنے جاتے ہیں۔ اس نظریہ کے تحت غلط یا صحیح کا اندازہ اس بات سے ہو گا کہ عوامی نمائندوں کی اکثریت کس رائے یا قانون کے ساتھ ہے۔ اگر اکثریت کا اتفاق کسی غلط رائے پر ہو گیا تو وہی صحیح اور اسی کے مطابق فیصلہ لیا جائے گا۔ جیسا کہ بہت سے قوانین، جمہوری حکومتوں میں پاس کر دیے جاتے ہیں جس میں بعض طبقوں کی حق تلفی ہوتی ہے لیکن چونکہ انہیں اکثریت کی تائید حاصل ہوتی ہے اس لیے وہی قانون بن جاتا ہے۔ عوامی نمائندوں کی اس جمہوریت میں ایک طرح کی آمریت کا عکس نظر آتا ہے لیکن ٹیپو کی جمہوریت اس آمریت کے بجائے اسلامیت کے عنصر کی حامل تھی۔ ایک ایسے زمانہ میں جب صرف بادشاہت تھی اور فیصلہ کا کلی اختیار بادشاہ کو حاصل تھا، اگر اس طرز حکومت سے ہٹ کر جس میں رعایا کے بعض قابل اشخاص کو خصوصی اختیارات ملے ہوں اور اس سے بھی بڑھ کر جہاں ہر شخص مساوات کا درجہ اور آزادانہ طور پر رائے دہی کا حق پائے ناقابل تصور ہے لیکن

---

(۷) شیر ہندوستان، ٹیپو سلطان چند تاریخی حقائق، ص ۱۲

تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ ٹیپو نے اس قسم کے حقوق اپنی رعایا کو دے رکھے تھے۔ اس کے طرز حکومت میں شخصی اقتدار کے بجائے پارلیمانی انداز حکمرانی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس کا حکم تھا کہ امرا و اعیان سلطنت سال میں ایک بار اکٹھا ہو کر سلطنت کے انتظامی امور و معاملات میں مشورے دیا کریں۔ محب الحسن اس کے جمہوری طرز حکومت کے متعلق رقم طراز ہیں:

> مرکز میں سات خاص کچہریاں یا محکمے تھے۔ ہر محکمے کا ایک بورڈ ہوتا تھا جو ایک اعلیٰ افسر اور اس کے ماتحت افسروں پر مشتمل ہوتا۔ اس طرح سات بورڈ تھے اور ہر بورڈ کا علاحدہ علاحدہ وقتاً فوقتاً اجلاس ہوتا تھا جس میں متعلقہ شعبہ کے معاملات زیر بحث آتے۔ کارروائی کے رجسٹر میں ہر ممبر اپنے خیالات قلم بند کرنے کے بعد اپنے دستخط ثبت کرتا۔ یہ رجسٹر کارروائی ایک سربہ مہر صندوق میں رکھا جاتا۔ تمام فیصلے ووٹوں کی اکثریت سے کیے جاتے۔ ان بورڈوں کی کارروائیوں سے ٹیپو کو ہمیشہ مطلع کیا جاتا۔ اکثر مختلف بورڈوں کے مشترک جلسے بھی ہوتے جن میں مشترکہ دلچسپی کے مسائل زیر بحث آتے۔ ٹیپو کا طریقہ یہ تھا کہ جب کبھی اسے کوئی فیصلہ کرنا ہوتا تو پورا دن اس پر غور و خوض میں گزارتا۔ اس کے بعد اپنے خاص افسروں کی رائے طلب کرتا۔ وہ لوگ پہلے آپس میں اس معاملہ پر بحث کرتے پھر اپنی تحریری رائے پیش کرتے۔ ان کی آرا کو اپنی رائے سے مقابلہ کرنے کے بعد ہی وہ قطعی احکام جاری کرتا[۸]۔

جمہوریت کے اہم مظاہر میں مساوات کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ٹیپو کے اندر یہ جذبہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ہر شخص کے ساتھ ٹیپو کے مساویانہ برتاؤ کا تذکرہ انگریز مصنفوں نے بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ فرانس کو جس جمہوریت پر ناز ہے ٹیپو کے لیے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ مؤرخ مارک ولکس (Mark Wilks) نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے:

> جمہوریت، جس کی اس وقت فرانس میں دھوم تھی، ٹیپو کے لیے کوئی نئی یا تعجب خیز بات نہ تھی۔ اس نے ہر شخص کو مساوات دے رکھی تھی[۹]۔

اس کے علاوہ محب الحسن نے مؤرخ ہنری ہربرٹ ڈوڈول کا بیان نقل کیا ہے کہ اس نے

---

[۸] محب الحسن، تاریخ ٹیپو سلطان، ترجمہ: حامد اللہ افسر، عتیق اللہ صدیقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۰ء، ص ۴۵۶

[۹] بحوالہ شیر ہندوستان، ٹیپو سلطان چند تاریخی حقائق، ص ۵۳

شاہی سلطنت میں سب سے پہلے جمہوری طرز کا تجربہ کیا اور کامیاب رہا: ”ٹیپو پہلا فرماں روا تھا جس نے اپنے نظم و نسق میں مغربی طور طریقے داخل کیے“(۱۰)

ٹیپو کی رواداری پالیسی: ٹیپو کی سلطنت میں مختلف مذاہب اور نسل کے لوگ رہتے تھے۔ ٹیپو کے یہاں مذہبی تفریق روا نہیں رکھی جاتی تھی۔ اس کے یہاں فیصلے غیر جانب دارانہ ہوتے تھے۔ چنانچہ ایسے بہت سے واقعات کتابوں میں مذکور ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ٹیپو نے قومی وریاستی اتحاد کو اپنے حکومتی معاملات میں اولیت دے رکھی تھی۔ اس کا یہ نظریہ اصل میں اسلامی فکر و تعلیم کا نتیجہ تھا۔ ”سلطنت خداداد“ کے مصنف نے ایک انگریزی اخبار سے ایک مضمون کا اردو ترجمہ نقل کیا ہے، اس کے چند اقتباسات ذیل میں لکھے جاتے ہیں:

یہ بادشاہ بہت بہادر تھا۔ اس نے ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنے کے لیے فرانس کے مشہور بہادر نپولین بوناپارٹ اعظم سے بھی بات چیت کی تھی۔ یہ بادشاہ جس قدر بہادر تھا اسی قدر خدا ترس اور بے تعصب۔ اس کی نگاہ میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر تھے۔ کسی مذہب سے وہ تعرض نہیں کرتا تھا۔ مالابار میں گوروایور کا مندر بہت پرانا اور مشہور ہے۔ مالابار کے ہندوؤں کا اگر اس کو کعبہ کہا جائے تو بیجا نہ ہو گا۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں کے مشہور دیوتا اوتار کرشن جی مہاراج کے والد واسدیو نے وشنو کی یہ مورت اپنی پرستش کے لیے ایک خواب دیکھ کر بنائی تھی اور گرو برہسپتی اور واسدیو نے جنوبی ہند میں ایک مقام تلاش کر کے یہ مورت نصب کی اور اسی لیے اس کا نام گوروایور قرار پایا۔ ٹیپو جب مالابار کو فتح کرتا ہوا اس کے قریب پہنچا تو اس مندر کے پجاری بہت گھبرائے اور انہوں نے دیوتا کی بیش قیمت مورت کو ریاست ٹراونکور کے ایک مندر میں بھیج دیا۔ ان دنوں مسلمانوں کی مرہٹوں سے لڑائیاں ہو رہی تھیں اس لیے بعض مسلمان سپاہیوں نے از رہ انتقام اس مندر کو جلا کر خاک کر دینا چاہا۔ عمارت تھوڑی ہی جلنے پائی تھی کہ ٹیپو سلطان کے افسروں کو اپنے بادشاہ کے احکام کا خیال آ گیا اور انہوں نے جلدی جلدی آگ بجھا کر مندر کے دو تین برہمنوں کو ٹیپو سلطان کے پاس بھیجا کہ وہ جا کر شورش پسند سپاہیوں کی شکایت کریں۔ ٹیپو سلطان نے جس وقت پجاریوں سے یہ سنا کہ چند شریر سپاہیوں نے مندر

(۱۰) تاریخ ٹیپو سلطان، ترجمہ: حامد اللہ افسر، عتیق اللہ صدیقی، ص ۴۵۶

میں آگ لگانے کی کوشش کی تو وہ بہت ناراض ہوا اور رات ہی رات سفر طے کر کے گورواپور پہنچا اور یہاں پہنچ کر اس نے تحقیقات شروع کی اور جن مسلمان سپاہیوں نے مندر میں آگ لگانے کی کوشش کی تھی ان کو سخت سزا دی اور حکم دیا کہ اس شہر سے جو کچھ آمدنی ہو وہ سرکاری خزانے میں داخل کرنے کے بجائے ہمیشہ اس مندر کو بخش دی۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ پجاریوں نے اس کے خوف سے مورت کوٹراونکور بھجوادیا ہے تو اس نے حکم دیا کہ دیوتا کی مورت کو فوراً واپس منگا کر اس مندر میں نصب کیا جائے[11]۔

جو قومیں اقتدار میں ہوتی ہیں وہ اپنے سلاطین و حکام اور افسران سے یہ توقع رکھتی ہیں کہ وہ اپنے ہم مذہبوں کی دوسرے فرقوں کے ساتھ زیادتیوں اور ظلم و جبر پر چشم پوشی کریں گے۔ اس سے نہ صرف زیادتی کرنے والوں کا حوصلہ بڑھا رہتا ہے بلکہ اس کے نتیجے میں ظلم کی ٹہنی ہمیشہ ہری رہتی ہے۔ لیکن ٹیپو کے مزاج میں اس قسم کی قومی عصبیت نہیں تھی۔ اس کے افسران بھی اس کی اس عادت شریفہ سے واقف تھے، اس لیے اس طرح کا کوئی قدم اٹھانے سے وہ بھی گھبراتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک مسلمان بزرگ نے ٹیپو سے ہندوؤں کی مسلمانوں پر حملے اور زیادتی کی شکایت کی اور اس جھگڑے کو اسلام پر حملہ ثابت کر کے اس کو کفر و اسلام کی توہین قرار دیا اور کہا کہ سلطان ان کے خلاف قدم اٹھائے ورنہ میں حدود سلطنت سے باہر چلا جاؤں گا۔ سلطان نے اس کی کوئی پروا نہیں کی اور واضح کر دیا کہ سلطنت کی نظر میں ہندو مسلمان دونوں برابر ہیں۔ سلطان کے اس عادلانہ اور حکیمانہ فیصلہ کی تفصیل لارڈ ولنشیا نے فراہم کی ہے جو پڑھنے کے لائق ہے:

پیر لدا نامی ایک بزرگ سرنگاپٹم میں رہتے تھے۔ انہوں نے ایک بار شکایت کی کہ ہندوؤں نے ان کے معتقدوں کو بہت مارا پیٹا ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ زیادتی مسلمانوں کی ہے۔ ہوا یہ تھا کہ ہندوؤں کا جلوس جا رہا تھا جس پر مسلمانوں نے حملہ کر دیا۔ پیر لدا نے کہا کہ ہندوؤں کا اس طرح مسلمانوں کو مارنا گویا اسلام کی توہین کرنا ہے اور یہ سلطنت بحیثیت ایک اسلامی سلطنت ہونے کے اس کا فرض ہے کہ اسلام کو ایسی توہین سے بچائے اور اس معاملہ میں قرار واقعی قدم اٹھایا جائے تاکہ آئندہ اور اسی طرح آزادانہ دست برد کا سلطان ہی باعث نہ ہو

---

(11) محمود خان محمود بنگلوری، تاریخ سلطنت خداداد (میسور)، کوثر پریس، میناچی کوئل کراس، معسکر بنگلور، ۱۹۳۴، ص ۳۶۶-۳۶۵

جائے۔ جواب ملتا ہے کہ سلطنت کی نظر میں ہندو اور مسلمان دونوں مساوی ہیں۔ پیر لدا نے کہا کہ اگر یہی حال رہا تو میں حدود سلطنت سے باہر چلا جاؤں گا جس پر سلطان کی طرف سے جواب ملتا ہے کہ جو مرضی میں آئے کیا جائے۔ پیر لدا مدراس جا کر مقیم ہوئے اور وہیں رہ گئے[۱۲]۔

عہد ٹیپو میں ہندوستان اور ہندوؤں کے حالات: ٹیپو ہندوستان اور ہندوؤں کے متعلق جو صائب اور درست رائے رکھتا تھا اس کی وجہ سے بھی وہ اتحاد باہمی کی پالیسی پر عمل اور اپنی سیاسی زندگی میں اس کو اہمیت دینے پر مجبور تھا۔ سلطنت خداداد کے مصنف کا بیان ہے کہ سلطان دیکھ رہا تھا کہ ہندو بہ حیثیت قوم کس قدر تباہ، پست خیال اور ان کی فطرت میں دوسروں کی غلامی کس قدر سرایت کیے ہوئے ہے۔ ان کے اندر ذات پات کے کس قدر جھگڑے ہیں۔ وہ ان کو اس صورت حال سے باہر نکالنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہندو مسلمان باہم مل کر رہیں۔ ہندوستان جیسا عظیم الشان ملک، جو خدا کی طرف سے عطیہ کے طور پر انہیں ملا ہوا ہے، اس کو ایک نعمت سمجھیں۔ اسی وجہ سے اس نے اتحاد بین الاقوام کی کوشش بھی کی تھی اور ہر ہندو مسلم ریاست کو خطوط لکھے تھے کہ انگریزوں کو ملک سے نکالنے کے لیے باہم مل کر متحدہ محاذ تیار کریں اور پوری یکسوئی کے ساتھ ان کا مقابلہ کریں۔

محمود خاں محمود بنگلوری لکھتے ہیں:

> سلطان کی تمنا تھی کہ ہندو اور مسلمان آپس کی نااتفاقی کو چھوڑ کر یکجا ہو جائیں۔ اس لحاظ سے اس نے اپنے ہر محکمہ میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کو بھی رکھا۔ فارسی کے ساتھ ساتھ کنڑی دفتر بھی تھا۔ اس کے وزیر ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ اور اسی خیال سے اتحاد بین الاقوام ہند کے لیے اس نے جو کوشش کی اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ ہندوستان کی کوئی ہندو یا اسلامی سلطنت وریاست ایسی نہیں تھی جہاں سلطان کے خطوط اور سفیر نہیں پہنچے[۱۳]۔

بھگوان گڈوانی ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

> سلطان ٹیپو چاہے کچھ بھی ہو مگر متعصب اور فرقہ پرست ہرگز نہیں تھا۔ وہ قوم و وطن کا سچا

---

[۱۲] ماخذ سابق، ص ۳۶۶ - ۳۶۷

[۱۳] ماخذ سابق

جاں نثار سپوت تھا۔ قومی شہید تھا اور اسے اسی مرتبے کے لحاظ سے یاد کیا جانا چاہئے۔ ٹیپو کے انیس فوجی جنرلوں میں دس ہندو تھے۔ اس کے تیرہ وزیروں میں سات ہندو تھے۔ اس کا استاد گوردھن پنڈت تھا(۱۴)۔

ہندو عورتوں کی عزت و توقیر میں اضافہ: سلطان بذات خود باحیا تھا اور یہی حیا وہ پورے معاشرے اور اپنی رعایا میں بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ محمود خان محمود لکھتے ہیں کہ جس وقت انگریزوں سے جنگ ہو رہی تھی تو اس کو معلوم ہوا کہ پائیں گھاٹ میں چند مسلم عورتوں نے گوروں سے بے جا رسم و راہ بڑھالی ہے اور بالآخر انہوں نے زنا کا ارتکاب بھی کر لیا ہے تو سلطان نے اس جرم میں انہیں قتل کا حکم دے دیا تھا۔ اسی طرح کورگ اور ملیبار میں ہندو عورتیں محض چھوٹا سا تہمد باندھتی تھیں جس کے سبب ان کا سر و سینہ برہنہ رہتا تھا۔ سلطان نے فرمان جاری کیا کہ اس طرح کوئی عورت باہر نہ نکلے اور اگر نکلے تو اس کے لیے سزا مقرر تھی(۱۵)۔ اس وقت سے ان تمام علاقوں میں عورتوں میں سینہ ڈھک کر نکلنے کا رواج ہوا۔

محمود خاں محمود بنگلوری نے مصنف رئیس کی تاریخ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ٹیپو سلطان سے پہلے ہندو راج میں عورتوں کی حالت نہایت درجہ گری ہوئی تھی۔ وہ ہمیشہ ذلت و خوف سے ایک سہمی ہوئی زندگی بسر کرتی تھیں، علانیہ سر بازار فروخت کی جاتی تھیں۔ بڑے شہروں میں ان کی فروخت کے لیے خاص خاص منڈیاں تھیں اور ان منڈیوں سے راجہ کو آمدنی ہوتی تھی۔ جو سمایا چار کہلاتی تھی۔ لیکن ملک و معاشرہ میں عورتوں کی عزت واحترام بڑھانے کے لیے سلطنت خداداد نے اس قسم کی فروخت کو ممنوع قرار دے دیا تھا کہ کوئی بے چادر کے باہر نہ نکلے(۱۶)۔

تبدیلی مذہب کی عام ممانعت اور غیر مسلم علما کی توقیر: سلطان اسلام پر سختی سے کاربند تھا لیکن مذہب کے معاملے میں وہ اپنے والد کی پالیسی پر عمل پیرا اور سیاست کو مذہب سے ہمیشہ الگ

---

(۱۴) ہندوستان ٹائمز، ۴ فروری ۱۹۹۰ء، بحوالہ شیر ہندوستان، ٹیپو سلطان، چند تاریخی حقائق، ص ۴۷۔ بھگوان گڈوانی The Sword of Tipu Sultan نامی ناول (۱۹۷۶) کے مصنف ہیں جس کی بنیاد پر سنجے خان نے ٹیلیویژن سیریل بنایا۔

(۱۵) تاریخ سلطنت خداداد، ص ۳۶۰

(۱۶) ماخذ سابق ص ۳۶۱

رکھتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی رعایا میں جس نے جو مذہب اختیار کیا ہے اس پر آزادانہ کاربند رہے۔ کوئی کسی کو زور زبردستی لالچ دے کر اس کے مذہب کو تبدیل نہ کرے۔ چنانچہ ایک علاقے میں ہندوؤں کے عیسائیت قبول کرنے کا اسے علم ہوا تو اس نے ان لوگوں کو آبائی مذہب تبدیل نہ کرنے کا حکم دیا۔ محمد خاں محمود بنگلوری لکھتے ہیں:

نواح کورگ میں اکثر ہندو لوگ عیسائی مذہب قبول کرتے جاتے تھے تو اس پر سلطان نے انہیں لکھا کہ وہ اپنے آبائی مذہب کو ترک نہ کریں۔ مگر جب چھ دفعہ لکھنے پر بھی اس کا اثر نہ ہوا تو آخر سلطان نے لکھا کہ میں حکم دیتا ہوں کہ آئندہ تم میں کا کوئی شخص اپنا آبائی مذہب ترک نہ کرے اور اگر ایسا ہی تبدیلی مذہب کا شوق ہو تو خود اپنے بادشاہ کا جو ظل اللہ ہے مذہب اختیار کریں[۱۷]۔

سلطان کا یہ حکم کس قدر منصفانہ اور حکمت آمیز ہے۔ مذہب کے تئیں اس کا یہی جذبہ تھا جو اس کو دوسرے مذاہب کے علما اور گروؤں کی توقیر و قدردانی پر آمادہ کرتا تھا۔ جگد گرو شنکر آچاریہ کے نام ایک خط میں اس نے جس قسم کے الفاظ ان کے لیے استعمال کیے ہیں ان سے غیر مسلم مذہبی رہنماؤں کے متعلق اس کے جذبات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ان کے نام ایک خط میں لکھتا ہے:

شریمہ، پرم ہمساو شنگری، سوامی سچدانند بھارتی چند۔ مہاراج کی خدمت میں سلطان ٹیپو کا سلام۔ سری مہاراج کے گرامی نامہ سے خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ آپ جگد گرو ہیں۔ اللہ پاک سے دعا فرماتے رہیے۔ آپ ایسے بزرگ ہیں جس ملک میں ہوں وہاں بارش رحمت ہوتی رہتی ہے۔ جس غرض کے لیے آپ پردیس تشریف لے گئے ہیں اس کو سرانجام دے کر اپنی قیام گاہ پر جلد واپس آنے کی کوشش فرمایئے۔ ٹیپو سلطان[۱۸]

ٹیپو کشادہ ظرف اور وسیع النظر تھا۔ اس کی اس خوبی کا اعتراف مؤرخین نے کیا ہے۔ مہاتما گاندھی جی نے کھلے دل سے اس کی اس فیاضی و سیر چشمی اور فراخ دلی کا تذکرہ کیا ہے:

---

[۱۷] ماخذ سابق ص ۳۶۳

[۱۸] ماخذ سابق ۳۶۳ - ۳۶۴

ٹیپو نے مندروں کے لیے بڑی فیاضی سے جائیدادیں وقف کیں اور خود اس کے محل کے چاروں طرف سری وینکٹار منّا، سری نواس اور شری رنگ ناتھ کے مندروں کی موجودگی سلطان کی وسیع النظری اور رواداری کا ثبوت ہے[۱۹]۔

ٹیپو کی بے تعصبی کی ایک اور مثال: میسور کی تیسری جنگ میں انگریز، مرہٹہ اور نظام نے مل کر میسور پر حملہ کیا۔ مرہٹہ فوج نے تمام ملک لوٹ لیا اور مقامات مقدسہ بھی تباہ کیے۔ سرینگری کے گرو نے سلطان کو لکھا کہ انہوں نے مجبوراً کسی اور جگہ اقامت اختیار کی۔ خط میں یہ اطلاع بھی دی کہ مرہٹوں نے مندروں میں گھس کر برہمنوں کو قتل اور زخمی کیا ہے۔ مندروں میں جو کچھ اثاثہ تھا لے کر چلے گئے۔ بغیر حکومت کی مدد کے دیوی کے بت دوبارہ نصب نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ سلطان نے اس کے جواب میں لکھا:

ان لوگوں کو جو مقدس مقامات کی بے حرمتی سے باز نہیں آتے یقین ہے کہ اس کلجگ میں انہیں بہت جلد اپنی کرتوتوں کا خمیازہ ملے گا۔ لوگ بدی کا کام ہنستے ہوئے کرتے ہیں لیکن خمیازہ روتے ہوئے بھگتیں گے۔ گروؤں سے دغابازی خود اپنی نسل کو منقطع کرنا ہے[۲۰]۔

ٹیپو نے اس خط کے ساتھ ایک حکم نامہ نگر کے آصف کے نام بھیجا جس میں دو سو راحتی (سلطانی اشرفی) نقد اور دو سو راحتی کے اجناس گروجی تک پہنچانے کا حکم تھا۔ گروجی کو لکھا:

آپ کو اختیار ہے کہ انعامی دیہات سے جن چیزوں کی ضرورت ہو حاصل کر لیں۔ اس رقم اور اجناس سے سارا دیوی کے بت کو نصب کرتے ہوئے برہمنوں کو کھانا کھلائیں اور ہمارے دشمنوں کی تباہی کے لیے دعا کریں[۲۱]۔

گروجی کے نام ایک خط میں سلطان نے لکھا:

آپ کی حسب مرضی پوجا کے دنوں میں روزانہ ایک ہزار برہمنوں کو کھانا کھلانے اور نقدی

---

[۱۹] اخبار ینگ انڈیا، ۲۳ جنوری ۱۹۳۰ء، بحوالہ شیر ہندوستان، ٹیپو سلطان، چند تاریخی حقائق، ص ۹۷
[۲۰] محمود خان محمود بنگلوری، صحیفۂ ٹیپو سلطان، گوشۂ ادب لاہور، ۱۹۴۷ء، حصہ اول، ص ۹۷
[۲۱] ماخذ سابق ص ۹۷

دینے کے متعلق نگر کے آصف کو حکم بھیج دیا گیا ہے[۲۲]۔

اس طرح کے بہت سے دلائل اور مثالیں ہیں جن سے ٹیپو کی اتحاد بین الاقوام پالیسی، جمہوری طرز حکومت، اپنی رعایا سے بلا تفریق مذہب وملت محبت، بالخصوص ہندوؤں سے غیر متعصبانہ رویہ اور روادارانہ برتاؤ کا اظہار ہوتا ہے جس کا اعتراف انصاف پسند مصنفین نے کیا ہے۔ اس قسم کی روشن مثالوں اور واقعات کے باوجود بعض انگریز مؤرخوں کرک پیٹر اور ولکس وغیرہ نے ٹیپو کو متعصب اور متشدد قرار دیا ہے۔ محب الحسن لکھتے ہیں کہ کرک پیٹر کے نزدیک ٹیپو عدم روادار، متعصب یا غضب ناک متشدد تھا۔ ولکس نے تاریخ میسور میں جبریہ تبدیل مذہب کے، اجتماعی ختنوں کے، مندروں کے ڈھانے اور ان کی جائیدادوں کے ضبط کیے جانے کے جعلی قصے بیان کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ٹیپو متعصب تھا اور اس نے ایک ایسے عہد میں بد ترین قسم کی مذہبی عقوبت رسانی کی تجدید کی جب کہ وہ صرف تاریخ کی کتابوں ہی تک محدود رہ گئی تھی۔ رابرٹ اور سار دیسائی جیسے جدید مؤرخوں نے بھی اسی نوع کے خیالات کا اظہار کیا ہے[۲۳]۔

سطور بالا سے اس کی شخصیت کی جو تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے اس سے اس کے متعصب نہیں بلکہ ایک ایسے روشن خیال، رعایا پرور، معتدل، میانہ رو اور روادار حکم راں کی حیثیت واضح ہوتی ہے جس نے اپنی حکومت میں ہندوؤں کو اعلیٰ مناصب عطا کیے۔ انہیں بت پرستی کی مکمل آزادی تھی۔ مندروں اور برہمنوں کو معافیاں دیں۔ بت تراشنے کے لیے رقمیں دیں اور متعدد مواقع پر نئے اور جنگوں میں تباہ ہونے والے مندروں کی از سر نو تعمیر کرنے ہی کا نہیں بلکہ آئندہ اس کو جاری رکھنے کا سامان مہیا کرایا۔ کبھی کبھی ہندو رعایا کے ساتھ اس کی بد سلوکی کے جو واقعات تاریخوں میں ملتے ہیں تو اس کی وجہ مذہب یا قومیت نہیں بلکہ ان ہندوؤں کی سلطان کے ساتھ غداری ہے۔ یہ بات بالکل طے اور مبنی بر حقیقت ہے کہ اس نے سلطنت کے انتظامی معاملات میں اپنے ذاتی، یا دوسرے لفظوں میں اسلامی عقائد کو، اثر انداز ہونے نہیں دیا۔ اس نے ہمیشہ عدل وانصاف کے قیام کو ترجیح دی۔ اگر کسی مسلمان نے غداری کی تو اس کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کیا جیسا ہندوؤں کے ساتھ کیا۔ اگر اس کے اندر مذہبی عناد وتعصب اور بھید بھاؤ ہوتا اور رواداری نہ

---

[۲۲] ماخذ سابق، ص ۸۰

[۲۳] تاریخ ٹیپو سلطان، ص ۴۹۰

ہوتی تو ہندوؤں کو ذمہ دارانہ عہدوں پر فائز نہیں کرتا۔ ٹیپو کے مستند سوانح نگار محب الحسن انگریزوں اور ہندو محققوں کی مستند کتابوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> حیدر علی نے ہندوؤں کو ذمہ دار عہدوں پر مامور کیا تھا۔ ٹیپو نے بھی اپنے باپ کی پالیسی کو جاری رکھا۔ پرنّیا میر آصف کے بے حد اہم منصب پر اور کرشن راؤ کو افسر خزانہ کے عہدہ پر اس نے فائز کیا تھا۔ شمیا آینگر ڈاک اور پولیس کا وزیر تھا۔ اس کے بھائی نرسنگاراؤ کے پاس سرنگاپٹم میں متعدد اہم عہدوں پر رہے تھے۔ سری نواس راؤ اور اپاجی رام ٹیپو کے معتمد خصوصی تھے، جنھیں اہم سفارشی مشنوں پر بھیجا جاتا تھا۔ مولچند اور سوجان رائے مغل دربار میں اس کے وکیل تھے۔ مالک راؤ اور نائک سنگانا پر بھی سلطان کو حد درجہ اعتماد تھا۔ اس کا پیش کار خاص سباراؤ ہندو تھا۔ اس کا ایک منشی نرسئیا ہندو ہی تھا۔ ایک برہمن کو کورگ کا فوج دار مقرر کیا گیا تھا۔ ایک اور برہمن کو مالابار کے جنگل کاٹنے کا بلاشرکت غیرے ٹھیکہ دیا گیا تھا۔ ایک دوسرے برہمن کو کوئمبٹور کا آصف مقرر کیا گیا تھا۔ پھر یہی عہدہ اسے پالگھاٹ میں دیا گیا۔ ٹیپو کے بہت سے عامل اور مال کے افسر ہندو تھے۔ فوج میں بھی ہندوؤں کو اہم عہدے دیے گئے تھے۔ ہری سنگھ باقاعدہ سواروں کا رسالدار تھا۔ نائروں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے روشن خاں کے ساتھ سری پت راؤ کو بھی متعین کیا گیا تھا۔ سیواجی، جو مرہٹہ تھا، کے ہاتھ میں تین ہزار سواروں کی کمان تھی اور ۱۷۹۱ء میں بنگلور کے محاصرے کے وقت وہ بڑی دلیری سے لڑا تھا۔ راماراؤ نامی ایک برہمن بھی سواروں کا کمانڈر تھا[۲۴]۔

افسوس کہ ایسے غیر متعصب، اتحاد بین الاقوام کے نقیب، محب و شہید وطن حکمراں کا ایثار و کردار اب مشکوک و معرض تنقید ہے اور اس پر طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اس شخصیت کو اب نصاب کی کتابوں سے بھی نکالا جارہا ہے۔ اس قسم کے اقدامات ملک و وطن اور قوم و ملت کے لیے نقصان دہ، اس کی اجتماعی و معاشرتی اور تہذیبی و تمدنی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ جو طاقتیں ایسا کررہی ہیں وہ ملک کی بے داغ تصویر میں دھبہ لگانے، اس کی جمہوری اور غیر مذہبی حکومت کے چہرے پر ایک خاص مذہب کا رنگ چڑھانے اور اس کی رنگارنگی اور تنوع کو ختم کرنے کی کوشش کررہی ہیں۔ یہ یقیناً ملک کی سالمیت کے لیے بڑا خطرہ ہے۔

---

[۲۴] تاریخ ٹیپو سلطان، ص ۴۹۱

علامہ فراہی کی فارسی شاعری

ڈاکٹر ابوذر ندوی (جمدہاں)
Abuzarhateem2011@gmail.com

علامہ حمید الدین فراہی مشرقی یوپی کے مردم خیز خطہ اعظم گڑھ سے تعلق رکھتے تھے۔ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، شعور آیا تو مختلف اساتذہ سے کسب فیض کیا، جن میں علامہ شبلی نعمانی، مولانا عبدالحی فرنگی محلی اور مولانا فیض الحسن سہارن پوری وغیرہ رہے ہیں۔ ابتدائی عمر میں ان کے فارسی کے استاد مہدی حسن چِتاروی[۱] تھے، جن کا کچھ فارسی کلام ملتا ہے جس سے زبان پر ان کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔[۲]

مولانا عبدالماجد دریابادی نے علامہ فراہی کی ادبیاتِ فارسی و عربی کے اعتراف میں لکھا ہے کہ انہوں نے جو کچھ پڑھا شوق سے پڑھا اس لیے ادبیاتِ فارسی و عربی میں معاصرین سے بازی لے گئے، ممکن ہے مولانا شبلی سے بھی۔ فارسی و عربی دونوں پر بے تکلف اہل زبان کی طرح قدرت رکھتے تھے، فارسی میں بھی صاحب دیوان شاعر تھے، اور کلام جاہلیت کے گویا حافظ تھے۔ البتہ ان کی عربی عبارت بڑی گٹھی ہوتی تھی۔[۳]

مختصر حالات زندگی: علامہ فراہی کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے، تفسیر قرآن میں انہوں نے ایک منفرد شناخت بنائی، اصول تفسیر وضع کیے۔ ان ہی اصولوں پر کچھ سورتوں کی تفسیر کی، اپنے منہج کے مطابق چند شاگرد تیار کیے۔ علامہ نے عربی، اردو اور فارسی تینوں زبانوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے فارسی کلام کا مجموعہ ''نوائے پہلوی'' کے نام سے چھپا ہے، فارسی کا ایک اور مجموعہ ۱۹۰۳ء میں ''دیوان حمید فارسی'' کے نام سے بھی چھپا، جو اب نایاب ہے، اس میں

---

[۱] موضع چتارہ اعظم گڑھ کی طرف نسبت ہے۔

[۲] ذکر فراہی از شرف الدین اصلاحی دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر ۲۰۰۱ء ص ۷۵

[۳] عبدالماجد دریابادی، معاصرین، ادارہ انشائے ماجدی، رابندر سرانی کلکتہ، مطبوعہ ۱۹۹۷، ص ۱۲۲

دو قصیدے عربی کے بھی ہیں۔[۴]

"نوائے پہلوی" کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، "زمزمہ دری" اور "سرود پارسی" پھر ان دونوں کے ذیلی عنوانات ہیں۔ زیر نظر مضمون میں علامہ کے فارسی کلام کا حاصل مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

کائنات میں غور: غور و فکر انسان کا امتیاز ہے، قرآن مجید مختلف چیزوں پر غور کرنے کی بار بار دعوت دیتا ہے۔ کائنات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا ایک اصول مقرر ہے، جس کے تحت اس کا نظام چل رہا ہے۔ انقلاب الٹ پھیر اور تغیر کو یہاں ثبات حاصل ہے، کہتے ہیں:

نخست گرمئ ہنگامۂ بہاراں بیں سپس فسردگئ موسم خزاں دریاب[۵]

(موسم بہار کی ابتدائی گہما گہمی دیکھو اس کے بعد ذرا موسم خزاں کی فسردگی کا اندازہ کرو)

تشبیہ اور استعارے وغیرہ کلام میں زور پیدا کرتے ہیں۔ علامہ کے یہاں تشبیہ میں ندرت ملتی ہے، ذیل کے اشعار میں پھول کی شگفتگی سے سینے کے شگاف اور زخم کے کھلنے سے دروازہ کھلنے کو تشبیہ دیتے ہیں:

یکے بچاک گریبان گل نگاہے کن شگاف سینہ یاران خستہ جاں دریاب[۶]

(ذرا گل کے گریبان چاک کو دیکھو اسی سے خستہ جاں دوستوں کے سینوں کے شگاف کا اندازہ کرو)

پئے خدنگ تو ہر زخم را دہاں باز است چو میزباں کہ درش بہر میہماں باز است[۷]

(تمہارے تیر کی خاطر ہر زخم کا منہ پہلے سے کھلا ہے، جیسے میزبان کا دروازہ مہمان کے لیے کھلا ہوتا ہے)

شاعری میں تعلی، مبالغہ اور خودستائی بعض مرتبہ جائز ہوتی ہے، مضمون میں ندرت تو نہیں

---

[۴] ذکر فراہی، ص ۶۲۷

[۵] نوائے پہلوی از حمید الدین فراہی، دائرہ حمیدیہ مدرستہ الاصلاح، سرائے میر، ۱۹۶۷ء، ص ۶

[۶] ماخذ سابق، ص ۲۷۴

[۷] ماخذ سابق ص ۷

لیکن مبالغہ کے نمونے کے طور پر ذیل کے اشعار کو دیکھا جاسکتا ہے:

مراہماں برھت چشم خوں فشاں باز است　　سپیدہ می دمد و چشم اختراں بستند

دہان دیدہ بخمیا زہ ہم چناں باز است[۸]　　ہزار خم کدۂ خون جگر زیاں کردم

(سپیدۂ سحری نمودار ہو رہا ہے، ستاروں کی آنکھیں بند ہوئیں، مگر میری لہو روتی آنکھیں اب بھی تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔ میں نے خون جگر کے ہزاروں میخانے برباد کر دیے اور حال یہ ہے کہ آنکھیں اس طرح کے نقصان کے لیے اب کھلی ہیں (آمادہ ہیں)

عشق حقیقی: انسان خدا کی تلاش میں ہمیشہ سے سرگرداں رہا ہے اور اس کی حقیقت کو پانے کے لیے مختلف طریقے اختراع و اختیار کیے ہیں۔ طرح طرح کی ریاضتیں کی ہیں، بھانت بھانت کی تپسیائیں اپنائی ہیں۔ تعذیب نفس کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے آسن ایجاد کیے ہیں۔ یہ دنیا اور اس کا کاروبار، یہ نت نئے ہنگامے، یہ بھاگ دوڑ اور گہما گہمی اسی ذات واحد کے دم سے ہے۔

نہ روز گرم نہ شبہائے دل سیہ دانست　　بکشور تو ہر آں رہ روے کہ رہ دانست

چراغ دیر، رخ نامۂ سیہ دانست　　برہمنے کہ بخاک تو دیدہ روشن کرد

فسون یک دم و آشوب یک نگہ دانست[۹]　　زہے کرشمہ کہ ہنگامہائے رستا خیز

(تیری دنیا میں جس مسافر کو تجھے پانے کا راستہ معلوم ہے، اس نے نہ دن کی گرمی دیکھی نہ رات کی تاریکی کا کچھ خیال کیا۔ جس برہمن نے تیری خاک سے آنکھ روشن کی اس کی نظر میں چراغ دیر اعمال نامہ بد کا سرورق ہے، آفریں ہیں کہ یہ قیامت خیز ہنگامے ایک نفس کا فسوں اور ایک نگاہ کا کارنامہ ہے)

حکمت: حکمت نوع انسانی کی مشترکہ وراثت اور مومن کی متاع گم گشتہ ہے، حکمت اور زندگی کے اصول پر مبنی دو اشعار درج ذیل ہیں:

آزار خو کن کہ درماں ہمی است　　بآغاز رو کن کہ پایاں ہمی است

---

[۸] ماخذ سابق ص ۷

[۹] ماخذ سابق ص ۸

براہے کہ ساماں بود بار گردن بینداز ساماں کہ ساماں ہمی است(۱۰)

(شروع تو کرو اس لیے کہ آغاز ہی انجام (کا پہلا قدم) ہے۔ دکھ اٹھانے کی عادت ڈالو، اس لیے کہ دکھوں کا خوگر ہونا ہی دکھوں کا علاج ہے۔ کسی راہ میں سامان زندگی بار ہو جائے تو اس بار کو اتار پھینکو اس لیے کہ یہی اس کا علاج ہے)

معاشرتی زندگی میں تعلی ایک مکروہ شے ہے، مگر شاعری میں تعلی لطف پیدا کر دیتی ہے ”آسماں چیر گیا نالہ بے باک مرا“ جیسے مصرعے اردو زبان میں بہت ملتے ہیں اور تعلی کی مثال سمجھے جاتے ہیں۔ اس طرح کے مصرعے علامہ کے یہاں بھی بڑے زوردار ملتے ہیں:

بسینہ چند کسے ایں فغاں نگہ دارد کشیم نالہ، خدا آسماں نگہ دارد

کشد ز ہر بن مویم زبانہ آتش دل نوائے گرم مراگر زباں نگہ دارد(۱۱)

(چند لوگ ہی اس فغاں کو سینے میں دبا کر رکھ سکتے ہیں، ہم نالہ کھینچ رہے ہیں اب خدا آسمان کی حفاظت فرمائے، اگر زبان ساتھ نہ دے تو آتش دل میری نوائے گرم کو لپٹ کی صورت میں میرے ہر بال کی جڑ سے باہر کھینچ سکتی ہے)

ریاکاری پر ضرب: ریاکاری اور منافقت ایک معاشرتی وبا ہے اور ہر زمانے میں پائی جاتی رہی ہے، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معاشرت کے جوہر یعنی اندرون و بیرون کی یکسانیت پر ابھارتے ہوئے کہتے ہیں:

چاک خواہیم زدن جامۂ پرہیز کہ ما رشک بر پاکئ رندان مے آشام بریم(۱۲)

(ہم پرہیز گاری کا جامہ چاک کر دینا چاہتے ہیں، اس لیے کہ ہمیں مے خوار کی پاک دامنی پر رشک آتا ہے)

جامہ، پہننے کے کپڑے کو کہتے ہیں، جس کا مقصد ستر پوشی، عیب پوشی یا زیب و زینت ہوتا ہے۔ جامہ پرہیز یعنی وہ پرہیز گاری جو اوپر سے اوڑھی گئی ہو، کوئی خرابی چھپانے کے لیے ہو یا دکھاوے کی ہو۔

---

(۱۰) نوائے پہلوی، ص۹

(۱۱) ماخذ سابق، ص۱۰

(۱۲) ماخذ سابق، ص۱۶

خوبیوں پر نگاہ: نکتہ چینی کرنے اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر رکھنے والوں کا اپنا مزاج ہوتا ہے، وہ نقائص کی تلاش میں رہتے ہیں اور بڑی بڑی خوبیوں اور روشن پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ علامہ ایسے لوگوں کو نادانوں کی صف میں جگہ دیتے ہیں اور انہیں نظر انداز کر کے آگے بڑھ جانے کا رویہ اپناتے ہیں۔

خوب من از بد نداند خردہ گیر خاک بر گفتار ہر ناداں کنم[۱۳]

(کیڑے نکالنے والا صرف میری خامیاں جانتا ہے، خوبیاں نہیں۔ اسی بنیاد پر مجھے پرکھتا ہے، میں ایسے نادان کی بات پر مٹی ڈالتا ہوں)

خوبصورت تشبیہ اور استعارہ: لب ور خسار اور سخن گیسوئے یار بھی اپنے جمال و کمال کے ساتھ نظر آتا ہے، ذیل کے شعر میں محبوب کی زلفوں کو جال سے اور دہن کو دانے سے تشبیہ دیتے ہیں (شعراء دہن یار کو چھوٹا باندھتے ہیں)

مپرس از دہن یارو دل بزلف ببند چو دام نیز چنیں دلکش ست دانہ مجو[۱۴]

(دہان یار کی بات مت پوچھ دل کو زلف کا اسیر کر لے، جب جال ہی اتنا دلکش ہے تو دانے کی جستجو نہ کر)

معاشرہ کی ایک مہلک بیماری تملق ہے، جو معاشرے کو دیمک کی طرح کھوکھلا کر دیتی ہے۔ کم فہم لوگ تملق کو فروتنی خیال کرتے ہیں، اس طرح تملق اور فروتنی کی سرحدوں کو ملادیتے ہیں؛ لیکن علامہ کہتے ہیں:

بر خاک سوسن است کہ مالد ہمیں زباں خواری نگر کہ لا بہ کند از فروتنی[۱۵]

(سوسن زمین پر پڑا ہے اور مٹی چاٹ رہا ہے ذرا ذلت دیکھو کہ کسر نفسی کے نام پر چاپلوسی کر رہا ہے۔)

دنیا کی بے ثباتی کو واضح کرنے کے لیے قانون فطرت سے استعارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

---

(۱۳) ماخذ سابق، ص ۱۷

(۱۴) ماخذ سابق، ص ۱۹

(۱۵) ماخذ سابق، ص ۲۰

مہمان چند ہفتہ بود رنگ و بوئے باغ　　تا در جہاں نہ شیفتۂ رنگ و بو شوی[۱۶]

(باغ میں رنگ و بو اور بہار چند دنوں کے مہمان ہوتے ہیں (یہ ایک سبق ہے) تا کہ تم دنیا کے رنگ و بو پر فریفتہ ہو کر نہ رہ جاؤ)

نام و نمود سے اجتناب علامہ کے خمیر میں تھا۔ اپنے علمی کام پر نہ کبھی فخر کیا اور نہ کبھی اس بات کی کوشش کی کہ لوگ جانیں، نام و نمود کے تعلق سے اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

گویند کہ گمنام بدن از خامی است　　آوازہ و نام جو کہ خوش فر جامی است

در پیش فراہی اے نکو اندیشاں　　ایں جستن نام بدترین بدنامی است[۱۷]

(لوگوں کا خیال ہے کہ گمنام رہنا ایک عیب ہے، کوشش کرو کہ لوگ تمہیں جانیں، یہ خوش بختی کی بات ہے اے خیر خواہو! فراہی کی نظر میں نام و نمود کی کوشش بدترین بدنامی ہے)

حمد باری: حمد باری میں کائنات کی موزونیت، توازن اور قدرت کے قول و فعل کی ہم آہنگی جیسے خیالات کو نظم کرتے ہیں:

بہ زیر نگارش اگر راست بینی　　نہ یابی بجز راستی تار و پودش

جہاں را ازاں راست گفتار گفتم　　کہ از ہم جدا نیست گفتار و کارش

اگر سرد و گرم است یا تلخ و شیریں　　یکے ژرف دستور بینی بکارش

ز دستور خود یکسر مو نہ گردد　　چناں چوں کہ بربست پروردگارش[۱۸]

(اس کی تخلیق میں اگر گہرائی سے غور کروگے تو کائنات کے تار و پود میں حق کے سوا کچھ نہ ملے گا، میں نے دنیا سے یہ حق بات کہہ دی کہ اس کے قول و فعل میں فرق نہیں سرد و گرم ہو یا تلخ و شیریں۔ اس کے کام میں ایک ہی بنیادی قانون ہر جگہ نظر آئے گا۔ یہ نظام اپنے اس دستور سے سر مو انحراف نہیں کرتا، جس پر اس کے پروردگار نے اسے متعین کر دیا ہے)

---

(۱۶) ماخذ سابق، ص ۲۱

(۱۷) ماخذ سابق، ص ۲۱

(۱۸) ماخذ سابق، ص ۲۲

علامہ کی ایک اور حمد "نوائے پہلوی" کے دوسرے حصے "سرود پارسی" میں بہ عنوان "سپاس نامہ" ہے۔ اللہ کی صفات کے ساتھ ساتھ اس میں اپنی بندگی کا اظہار بھی ہے اور حمد کے اخیر میں کہا گیا ہے کہ تیرا ٹھکانہ کسی نے نہیں دیکھا، مگر ہر دل سے ایک راہ نکلتی ہے جو تیرے دل تک جاتی ہے۔ حمد کے کچھ اشعار ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی صفات پر مبنی قرآنی آیتوں کا فارسی ترجمہ ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ اشعار میں ضمیر خطاب کی ہے۔ آیت کے ٹکڑے "سپاس نامہ" میں نہیں ہیں، وہ یہاں اس لیے لکھے جارہے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ کون سا مصرع کس ٹکڑے کا ترجمہ ہے:

اے فرازندہ بلند سپہر وے فروزندۂ ستارہ و مہر
رفیع السماوات الذی جعل الشمس ضیاء والقمر نوراً

اے ہمہ از تو یافتہ آغاز باز گشت ہمہ بسوئے تو باز
خلق کل شیئ الیہ یرجع الامر کلہ

ہم تو پیدا و ہم توئی پنہاں ہم تو آغاز وہم توئی پایاں[19]
ھوا الظاہر و الباطن ھو الاول و الاخر

"سپاس نامہ" ان اشعار پر ختم ہوتا ہے:

گرچہ یک کس ندید منزل تو از ہمہ دل رہے ست تا دل تو
نام تو مرہم ست بر دل ریش یاد تو شمع کلبۂ درویش[20]

(گو کہ کسی نے تیرا ٹھکانہ نہیں دیکھا (تاہم) تیرے دل کی طرف ہر دل سے ایک راہ نکلتی ہے،
تیرا نام زخمی دل کے لیے مرہم ہے، تیرا ذکر درویش کی کٹیا کے لیے ایک شمع ہے)

کائنات کے نظام میں تضاد: نظام کائنات میں دھوپ چھاؤں، بہار و خزاں لیل ونہار اور بہت سی متضاد اشیاء کا ایک سلسلہ ہے، اسی طرح بہار و خزاں کی آمد ورفت، گردش لیل ونہار اور صبح وشام کے آنے جانے سے گردش دوراں اور اس کی عملداری وجود پذیر ہوتی ہے، یہی چیز ہے جو انسان کے اندر حوصلہ اور امید پیدا کرتی ہے، اسے جینے کا سلیقہ سکھاتی ہے:

---

(۱۹) ماخذ سابق، ص ۳۵

(۲۰) نوائے پہلوی، حصہ سرود پارسی، ص ٦٦

من کہ پایان کاری بینم در خزاں نو بہار می بینم
در بہاراں بجوش لالہ و گل در چمن خار خار می بینم[۲۱]

(میں انجام کار دیکھتا ہوں مجھے خزاں میں نئی بہار دکھائی دیتی ہے، موسم بہار میں لالہ و گل کی کثرت سے چمن میں کانٹے ہی کانٹے نظر آتے ہیں)

ظاہر بینی کا دوسرا نام کم نگاہی ہے ”جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا“ ظاہر کی بنیاد پر فیصلہ صادر کرنے والے کو ظاہر بینی سے اجتناب کی نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

بنگر اندر جہان بژرف نگاہ تا بدانی سپید را ز سیاہ
در نکویاں نہفتہ بد باشند در بداں ہم نکو بود گہ گاہ
اے بسا ماہ روئے تیرہ دروں وی بسا تیرہ روئے دل چوں ماہ[۲۲]

(دنیا کو ذرا گہری نظر سے دیکھو تاکہ تمہیں اس کے سفید و سیاہ کا فرق معلوم ہو سکے، یہاں نیکوکاروں کی صورت میں برے لوگ چھپے ہوں گے اور کبھی کبھار برے لوگوں کے اندرون میں نیک بھی ہوں گے۔ کتنے ہی چاند سے روشن چہرے ہوں گے جن کا اندرون تاریک ہوگا اور کتنے ہی سیاہ رو ہوں گے جن کے دل چاند کی طرح چمکتے ہوں گے)

”چکامہا“، ”زمزمہ دری“ کا ایک حصہ ہے اس کی اکثر نظمیں حکمت زہد، زندگی کا انجام، بدی سے پرہیز، نیکی کی تشویق، انسان کی حقیقت، نیز دنیا اور اس کے پر فریب چہرے سے پردہ کشائی پر مشتمل ہیں:

اختر و چرخ را ہر چند بلندی ست مگر تو ہم از چرخ و ہم از اختر او بالائی
ہرچہ در زیر سپہرست ہمی فرساید تو ببالائے سپہری کہ نمی فرسائی[۲۳]

(آسمانوں اور ستاروں کو ہر چند کہ بلندی حاصل ہے مگر تو آسمانوں اور اس کے ستاروں سے بھی زیادہ بلند ہے، آسمان تلے موجود ہر چیز فرسودہ ہو رہی ہے، تو آسمانوں سے بھی بلند ہے، اس لیے کہ تجھ پر فرسودگی کا گزر نہیں)

---

(۲۱) ماخذ سابق، ص۶
(۲۲) نوائے پہلوی، ص۳۶
(۲۳) ماخذ سابق، ص۳۷

ذیل کے شعر میں دنیا کی حقیقت بتاتے ہوئے "نانک دکھیا سب سنسار" کی ترجمانی کی ہے، اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی واضح کی ہے کہ آنے والا ہر زمانہ گزرے زمانے سے برا ہوتا ہے:

ما وتو از بہر درد و رنج و افسوس آمدیم روزگار خوش دلے ای خواجہ پیش ازما گزشت[۲۴]

(ہم اور تم درد رنج اور افسوس کے لیے دنیا میں آئے ہیں۔ ہنسی خوشی کا زمانہ صاحب ہم سے پہلے گزر چکا ہے)

روح اور دل: شعراء اور فلاسفہ کے یہاں عقل اور دل کا مکالمہ یا قضیہ ملتا ہے۔ علامہ نے روح اور دل کا قضیہ "جان و دل" کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ دل کو نصیحت کرتے ہوئے اس قضیے کو فیصل کیا ہے اور روح کی عظمت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

کار جاں اے دل بچشم کم مبیں در سر جان ست باد آتشیں
ایں چراغ از آفتاب افروختہ است ویں بلندیہا ازاں آموختہ است
گرچہ جاں یک چند ہمپائے دل است سر بلند ست ار چہ پایش در گل است
ہم چو نیلوفر کہ خیزد از گل آب دیدہ نکشاید مگر بر آفتاب[۲۵]

(اے دل، روح کے عمل کو گری نظر سے نہ دیکھ، روح کے سر میں باد آتشیں موجود ہے (اور آگ کا سفر آسمان کی طرف ہوتا ہے) یہ وہ چراغ ہے جو آفتاب سے روشن کیا گیا ہے اور یہ بلندی اس نے آفتاب ہی سے سیکھی ہے۔ روح اگرچہ ایک طرح سے دل کے ہم پلہ ہے پر وہ سربلند ہے۔ اگرچہ اس کا پاؤں کیچڑ میں ہوتا ہے وہ کنول کی طرح کیچڑ سے نکلتا تو ہے مگر جب تک سورج سامنے نہ آئے آنکھ نہیں کھولتا)

گفتنیہا: یہ "زمزمہ دری" کا آخری ذیلی عنوان ہے، اس کے بعد "سرود پارسی" کا حصہ شروع ہوتا ہے، اس میں فلسفیانہ باتیں ہیں۔ عدم وجود سے وجود، تیرگی سے روشنی کا ظہور، موت سے بے خوفی اور موت کے بعد سرمدی زندگی کی یقین دہانی وغیرہ وغیرہ۔

---

[۲۴] ماخذ سابق، ص ۳۹

[۲۵] ماخذ سابق، ص ۴۰

گرچہ از مرگے بمرگے بگزری خویشتن را مردہ ہرگز نشمری(۲۶)

(اگرچہ ایک موت سے حیات ملی، پھر موت کی راہ سے گزرے پھر بھی اپنے آپ کو مردہ نہ سمجھو)

درج بالا شعر میں زندگی اور موت کی حقیقت بیان کرنے والی آیت ''قَالُوْا رَبَّنَا اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ(۲۷)'' کی طرف اشارہ ہے۔ جس میں دو زندگی اور دو موت کا تذکرہ ہے۔

فلسفی اور پیغمبر کا موازنہ: ''نیستی و ہستی'' کے عنوان سے ایک نظم ہے جس میں فلسفی اور پیغمبر کے بیچ موازنہ کیا گیا ہے:

فلسفی اندر بن چاہ نژند نردباں دارد بخورشید بلند
نردبانش می برد تا چند ارش پس بخاک افتد نگوں گشتہ سرش
واں پیمبر خود ز بام آسماں رشتہ افگندہ سوئے خاکیاں
رشتہ جاں را بدیں رشتہ بتاب پس برآ تا بارگاہ آفتاب
ز آسماں پیغمبر آوازت دہد فلسفی ازخاک پروازت دہد
ایں ز دوات رہ نماید سوئے جاں و آں بخواند خود ترا از کوئے جاں(۲۸)

(فلسفی آفتاب تک پہنچنے کے لیے اندھے کنویں میں سیڑھی لگاتا ہے، سیڑھی اسے تھوڑی دور لے جاتی ہے، اس کے بعد سر کے بل الٹتا اور زمین پر آرہتا ہے اور پیغمبر بام فلک سے اہل زمین کی طرف ایک ڈور (حبل) ڈال دیتا ہے۔ پیغمبر تجھے آسمان سے آواز دیتا ہے، فلسفی تجھے خاک سے پرواز دیتا ہے۔ یہ تجھے دور سے روح کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور وہ تجھے اسی کے کوچے سے آواز دیتا ہے)

مدحیہ قصیدہ: سلطان عبدالحمید خان کی مدح میں ۲۸/ اشعار پر مشتمل ایک قصیدہ ہے، اس قصیدے کو دیکھ کر مولانا فاروق چریاکوٹی نے کہا تھا کہ یہ اساتذۂ فن میں سے کسی کا معلوم ہوتا

---

(۲۶) ماخذ سابق، ص ۴۴

(۲۷) سورہ غافر، آیت ۱۱

(۲۸) نوائے پہلوی، ص ۴۹

ہے[۲۹] یہاں یہ بات کھٹکتی ہے کہ سید سلیمان ندوی (یاد رفتگاں ص ۱۲۸) اور مولانا امین احسن اصلاحی (مجموعہ تفاسیر فراہی ص ۲۱) دونوں کے مطابق پورا قصیدہ مولانا فاروق چریاکوٹی کے سامنے گیا اور شاعر کا نام پوچھے جانے پر انہوں نے کہا کہ یہ تو نہیں بتا سکتا کہ کس کا ہے لیکن پرانے اساتذہ/قدماء میں سے کسی کا معلوم ہوتا ہے سوال یہ ہے کہ قصیدے میں خلیفہ عبدالحمید خان کا نام ہے، پھر انہوں نے کیسے کہہ دیا کہ پرانے اساتذہ میں سے کسی کا معلوم ہوتا ہے، لہٰذا صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ مولانا چریاکوٹی کے سامنے قصیدے کے کچھ اشعار پیش کیے گئے ہوں گے، تب انہوں نے یہ رائے دی ہوگی، یہ قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

بے جلوۂ رخ تو بود مضطر آئینہ خار افگند بہ پیرہن از جوہر آئینہ
گیسوئے ہمچو شب تو بیا رائی وہم بصبح فرمائی، تا بیاورد از خاور آئینہ[۳۰]

(تیرا چہرہ سامنے نہ ہو تو آئینہ پریشان رہتا ہے اور اپنے جوہر سے ناگواری ظاہر کرتا ہے، تو شب تاریک کے گیسو سنوارتا اور صبح کے نام یہ فرمان جاری کرتا ہے کہ وہ آتے وقت مشرق سے آئینہ لے کر آئے۔ (سلطنت کا نظام بخیر وخوبی چل رہا ہے)

قصیدے کے مزید چند اشعار

ہم روئے تست آئینہ ہم عکس خود توئی در خورد حسن تو نبود دیگر آئینہ
سلطان دیں خلیفہ عبدالحمید خاں کش مثل در جہاں نبود جز در آئینہ
پیداست چہرۂ ظفر از تیغ تیز تو چوں پیکرے کہ باشد پنہاں در آئینہ
ہر چند پیکر سخن من بہ سادگی آئینہ است و سادہ بود بہتر آئینہ
از گوہر مدیح تو زیور گرفتہ است چوں گیر داز جمال بتاں زیور آئینہ
باد ازرخت چو آئینہ حیراں مر آفتاب چوں آفتاب پیش تو رخشاں مر آئینہ[۳۱]

(تیرا چہرہ ہی آئینہ ہے اور تو ہی اپنا عکس بھی۔ تیری خوبصورتی کے شایان شان کوئی دوسرا آئینہ

---

[۲۹] ذکر فراہی از شرف الدین اصلاحی، ص ۸۵

[۳۰] نوائے پہلوی، حصہ سرود پارسی، ص ۸

[۳۱] ماخذ سابق، ص ۸/۹/۱۰

نہیں۔ خلیفہ عبدالحمید خاں شاہ دیں ہیں۔ ان کے جیسا شخص صرف آئینے میں ہے، دنیا میں کہیں اور نہیں۔ تیری دھار دار تیغ سے فتح ظاہر ہوتی ہے، جیسے کوئی پیکر آئینے میں پوشیدہ ہوتا ہے، ہر چند کہ میرا کلام اپنی سادگی میں آئینہ ہے اور سادہ آئینہ اچھا ہوتا ہے۔ (مگر) میرا کلام تیری مدح کا زیور پہن کر آراستہ ہو گیا ہے، جس طرح آئینہ حسینوں کے جمال سے خود بھی آراستہ ہو جاتا ہے، آئینے کی طرح تیرا چہرہ دیکھ کر آفتاب بھی حیران ہو جائے، تیرے سامنے آئینہ بھی آفتاب کی طرح روشن ہو جائے)

بہار خرمی: یہ نظم ولیٔ عہد نیپال یوبراج جنگ بہادر رانا کی درخواست پر کہی گئی ہے۔ وہ خود بھی مشق سخن کرتا تھا اور "شادی" تخلص کرتا تھا، وہ الٰہ آباد میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا اور علامہ سے اصلاح لیتا تھا، اس نظم میں تخلص بڑے لطیف انداز میں استعمال ہوا ہے، یہ نظم ولی عہد کی اپنی ملکیت بھی ہو گئی اور بزرگ کی طرف سے نصیحت بھی، نظم اس شعر سے شروع ہوتی ہے:

بہار خرمی در گلشن گیہاں نمی بینم کہ بے صد خار غم اینجا گلے خنداں نمی بینم [۳۲]

(دنیا میں خوشی کی بہار کہیں نظر نہیں آتی سینکڑوں کانٹوں کے بغیر یہاں ایک پھول بھی کھلا ہوا نہیں دکھتا)

دنیا کی بے ثباتی، رنج و غم کا اظہار شعرا کی پہچان ہے ۔شہزادے کے حالات ایسے تھے کہ وہ جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس لیے بھی شاید یہ مضامین اس نظم میں در آئے ہیں۔ آگے کہتے ہیں:

بہر یک سینہ صد زخم ست و یک مرہم نمی یابم بہر یک گوشہ صد رنجور و یک درماں نمی یابم
چہ رنج ست آں کہ اندر گنج او پیدا نمی یابم چہ نیش ست آں کہ اندر نوش او پنہاں نمی بینم
ز رنگ و بوئے گلزار جہاں دلشاد کے گردد پئے شادی رہے جز طاعت یزداں نمی بینم [۳۳]

(ہر سینے میں سینکڑوں زخم ہیں اور مجھے کوئی کارگر مرہم دستیاب نہیں۔ ایک ایک گوشے میں سینکڑوں رنجور پڑے ہیں اور مجھے ایک دوا تک نہیں مل رہی ہے۔ کون سا رنج ہے جو دنیا کے خزانے میں نہیں ہے، کون سی چبھن ہے جو اس کے شہد میں نہیں، گلزار جہاں کے رنگ و بو

---

[۳۲] ماخذ سابق، ص۱۷

[۳۳] ماخذ سابق، ص۱۸

سے دل کیوں کر شاد رہ سکتا ہے "مسرت" کے لیے خدا کی اطاعت کے سوا مجھے کوئی چارہ نظر نہیں آتا)۔

شاعری کی ایک قدیم روایت: اردو یا فارسی ادب میں شیخ، ملا صوفی اور واعظ پر طنز و تعریض پرانی روایت ہے، علامہ نے بھی گاہے بہ گاہے اس جماعت پر طنز کیا ہے کہتے ہیں:

من از کمند حلقۂ واعظ رمیدہ ام — دل خستگیش بیں کہ شکارش زدام رفت[۳۴]

(میں واعظ کے حلقے سے نکل بھاگا ہوں، اس کی خستہ دلی کا اندازہ کرو کہ اس کا شکار جال میں آیا اور نکل گیا)

پوستینم مدر اے شیخ کہ بر دوشت ہم — آں ردا نیست کہ زیرش نبود زنارے[۳۵]

(شیخ میری پوستین نہ پھاڑیے، ذرا اپنا جائزہ لیجئے، آپ کے کاندھے پر بھی ایسی چادر ہوتی ہی نہیں جس کے نیچے زنار نہ چھپی ہو)

واعظ بسے حکایت رنگیں کند ولے — یک حرف اوز گوش سوئے دل نمی رود[۳۶]

(حضرت واعظ ایک سے ایک دلچسپ قصے سناتے ہیں، مگر ان کا ایک لفظ بھی سماعت سے گزر کر دل کی طرف نہیں جاتا)

علامہ کی بعض نظمیں اور غزلیں ادھوری معلوم ہوتی ہیں، کیوں کہ ان میں دو تین یا چار ہی اشعار ہیں، کہیں مطلب مفقود ہے، کہیں مطلع و مقطع دونوں غائب ہیں، اس کی وجہ غالبا یہ ہے کہ ترتیب دینے والوں کے ہاتھ پوری غزل یا نظم نہ آسکی[۳۷]۔ اسی طرح علامہ کے کلام میں دو تخلص ملتے ہیں، کہیں 'حمید' اور کہیں 'فراہی'۔ پہلے وہ 'حمید' ہی تخلص کرتے تھے، مگر جب انہیں معلوم ہوا کہ ان کے ایک دوست بھی 'حمید' تخلص کرتے ہیں تو انہوں نے "فراہی" تخلص اختیار کر لیا[۳۸]۔

---

[۳۴] ماخذ سابق، ص ۳۱

[۳۵] ماخذ سابق، ص ۵۴

[۳۶] ماخذ سابق، ص ۴۵

[۳۷] ذکر فراہی از شرف الدین اصلاحی، ص ۶۳۰

[۳۸] ماخذ سابق، ص ۶۵

باب التقریظ والانتقاد

”بیان شبلی“ از ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

کلیم صفات اصلاحی

بیان شبلی (حصہ ۱): صفحات: ۲۰۸، قیمت: ۳۰۰ روپے، ۲۰۲۰ء؛ (حصہ ۲): صفحات: ۲۲۴، قیمت: ۳۵۰ روپے، ۲۰۲۲ء؛ (حصہ ۳): صفحات: ۲۲۴، قیمت: ۳۵۰ روپے، ۲۰۲۳ء؛ (حصہ ۴): صفحات: ۲۰۸، قیمت: ۳۵۰ روپے، ۲۰۲۴ء؛ (حصہ ۵): صفحات: ۲۱۶، قیمت: ۳۵۰ روپے، ۲۰۲۴ء؛ (حصہ ٦): صفحات: ۲۲۴، قیمت: ۳۵۰ روپے، ۲۰۲۵ء؛ (حصہ ۷): صفحات: ۲۲۴، قیمت: ۳۵۰ روپے، ۲۰۲۵ء۔ تمام حصے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی نے شائع کیے ہیں جبکہ حصہ (٦) مرکزی پبلی کیشنز، جامعہ نگر، نئی دہلی سے شائع ہوا ہے۔

آثار شبلی، شبلی شناسی کے سو سال، شبلی اور جہان شبلی، نوادرات شبلی، افادات شبلی، شبلی سخنوروں کی نظر میں، شبلی خود نوشتوں میں وغیرہ کو پڑھ کر اندازہ ہوا تھا کہ اب شبلی اور متعلقات شبلی پر مزید معلومات وانکشافات کا سلسلہ تھم جائے گا لیکن اس کے بعد فاضل محقق نے شبلیات پر مزید مقالات کے مجموعے شائع کر کے اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا۔ ان کے علاوہ مزید مطالعۂ شبلی کے نتیجے میں ان کی شخصیت کے نئے نئے گوشوں اور پہلوؤں پر مقالات اور خود شبلی کی تحریروں کی بازیافت کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا جارہا تھا تو انہوں نے نئے نئے ناموں سے مجموعہ ہائے مقالات کے بجائے ایک مرکزی عنوان ”بیان شبلی“ کے تحت ان کی اشاعت کا فیصلہ کیا۔ یہ سلسلہ ۲۰۲۰ء میں شروع ہوا اوراس کے تحت مقالات کے اب تک سات حصے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ساتواں حصہ جو اب تک کا آخری حصہ ہے، ابھی حال ہی میں طبع ہوا ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب کی تیز گامی اور دست رسی سے کیا بعید کہ تازہ دم ہو کر پھر عازم سفر ہوں اوراہل علم اور شیدایان شبلی کے خوان ادب کے لیے پھر کوئی نیا گلدستہ پیش کر دیں۔ جیسا کہ انہوں نے حصہ (۷) کے دیباچے میں یہ بشارت سنائی بھی ہے کہ شبلی کے بارے میں کئی علمی منصوبے ابھی ناتمام ہیں، ان کا ذکر ان شاءاللہ بشرط حیات آئندہ بیان شبلی کے حصوں میں آئے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ بزم صرف شبلی سے عقیدت اوران

کے توسط سے ملک وملت کی محبت میں آراستہ کی ہے تاکہ ملک وملت کے نوجوانوں کے اندر اسلامی غیرت وحمیت اور علم وتحقیق کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو۔ ان کا حال یہ ہے کہ شبلی یا نسبت شبلی سے متعلق کہیں سے چند سطریں بھی ملیں تو انہیں سرمۂ نظر ہی نہیں بنایا بلکہ اس کے پس منظر وپیش منظر اور اس کی اہمیت وافادیت پر پورا مقالہ لکھ ڈالا۔ ذیل میں ''بیان شبلی'' کے اسی مفید سلسلے پر الگ الگ تبصرے کے بجائے ان کا تعارف پیش ہے تاکہ اس متاع علمی کے بارے میں ایک ہی جگہ بالاختصار وبالترتیب قارئین کو معلومات حاصل ہو جائیں۔

حصہ اول میں کل گیارہ مقالات ہیں جو شبلی کی شخصیت کے کسی نہ کسی نئے پہلو سے متعلق ہیں۔ اس کا پہلا مقالہ تصوف کے موضوع پر ایک نادر خطبہ ہے جو خواجہ حسن نظامی کی فرمائش پر دہلی میں تقریباً دو ہزار افراد کی موجودگی میں پیش کیا گیا تھا۔ شبلی کے نام معاصرین کے خطوط سے شبلی کی کئی حیثیتیں سامنے آتی ہیں۔ شبلی کے غیر مدون خطوط میں ۱۳ مزید خطوط اور ان کے نئے مکتوب الیہ کا تذکرہ ہے۔ کلام شبلی پر تضمین کے تحت۔ ایک مطالعے میں نئے انداز سے گفتگو اور نئی معلومات فراہم کی گئی ہے۔ اردو شارٹ ہینڈ کی اہمیت پر شبلی کے خیالات بہت سے لوگوں کے سامنے پہلی بار آئے ہیں۔ بیان شبلی نامی مقالے میں علامہ شبلی کے نام منسوب ''سیرت الصدیق'' اور ''سیرت علی'' نامی کتابچوں کا علم بھی کم ہی لوگوں کو ہوگا۔

حصہ دوم میں بھی کل گیارہ مقالات ہیں۔ پہلے مقالے میں علامہ شبلی کے فارسی خطوط کی اہمیت وادبی معنویت کے ساتھ ساتھ اس بات کی جانب بطور خاص توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ خطوط شبلی کی ابتدائی اور علی گڑھ سے وابستگی کے قبل کے سوانح کا بنیادی ماخذ ہیں۔ ۱۰ اشخاص کے نام یہ کل ۳۳ خطوط ہیں۔ دوسرے میں علامہ شبلی کے رسالہ ''بیان خسرو'' پر اس وقت کے اہم جرائد نیر اعظم (مرادآباد)، صحیفہ (بجنور)، آزاد اخبار (کانپور) وغیرہ کے تبصرے اور اس سے متعلق نظام المشائخ میں شائع شدہ تحریریں اپنے آپ میں الگ کشش رکھتی ہیں۔ علامہ شبلی کے نام منثور اور منظوم سپاس نامے جو شبلی کی عظیم الشان خدمات کے اعتراف میں مصر، علی گڑھ، حیدرآباد اور کلکتہ وغیرہ میں پیش کیے گئے شامل کتاب ہیں۔ وفات شبلی پر اس وقت کے مشہور رسائل واخبارات

جیسے الناظر (لکھنؤ)، الہلال (کلکتہ)، زمانہ (کانپور) اور زمیندار وغیرہ میں مطبوعہ تعزیتی تحریریں، تقریریں، قطعہ ہائے تاریخ اور مراسلات میں بیشتر نادر ونایاب ہیں۔ اس میں ان کو بھی جمع کیا گیا ہے۔ ایک مقالے میں رشید حسن خاں کے "مطالعہ شبلی" کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ شبلی کے کلام پر ان کی زندگی اور وفات کے بعد بھی تضمینیں کی گئی ہیں۔ اس کا مطالعہ بھی خاصا دلچسپ اور اہم ہے۔

تیسرے حصے میں کل ۹ مقالات ہیں۔ پہلا مقالہ نوادرات شبلی کے نام سے ہے جس میں تین اہم نودریافت تحریریں، ایک سیرت نبوی، دوسری حیات سعدی اور تیسری ایک سفارشی تحریر ہے۔ دوسرے میں شبلی سے متعلق چند قدیم وجدید کتابوں اور رسالوں کا ذکر اور تصانیف شبلی کے بعض انتخابات کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ایک مقالے میں تصانیف شبلی کے رد میں لکھی جانے والی ۲۷ کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ایک مقالے میں تحریک ندوہ کے شروع میں شبلی کے علاوہ اعظم گڑھ کے جن دوسرے اکابر نے حصہ لیا تھا ان کا ذکر کیا ہے۔ "مسافران شبلی منزل" میں عہد شبلی وسلیمان میں ملک کی جن ممتاز ونمایاں شخصیات جیسے محسن الملک، محمد علی جوہر، شیخ عبدالفتاح ابوغدہ، گاندھی جی اور جواہر لال نہرو وغیرہ نے دارالمصنّفین میں قدم رنجہ فرمایا ان کا حال لکھا گیا ہے۔ اردو وفارسی کے بعض قدیم وجدید سخنوروں کی شبلی کو منظوم خراج عقیدت اور ان کے کلام پر گفتگو آخری مقالے میں کی گئی ہے۔

چوتھے حصے میں دس مقالات ہیں۔ پہلے مقالے میں قدیم وجدید مطالعات شبلی مثلاً تذکرۂ جمیل میں ذکر شبلی، شبلی نعمانی کی "سیرۃ النبی" کا اسلوبیاتی مطالعہ اور ڈاکٹر خالد ندیم کی شبلی فہمی کا تحقیقی مطالعہ کے متعلق نئی معلومات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ دوسرے مقالے میں شبلی کی کئی نادر تحریریں، جو رسائل کے اوراق میں دبی ہوئی اور کسی مجموعے میں شائع نہیں ہوئی تھیں، کو شامل کیا گیا ہے۔ اس مجموعے میں جامع ازہر پر لکھا جانے والا وہ مقالہ بھی شامل ہے جو شبلی نے اپنے زیر ادارت نکلنے والی محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین میں لکھا تھا۔ ایک مقالے میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین میں شائع شبلی کی مرقومہ رودادیں بھی ہیں۔ ایک مضمون میں شبلی کی غیر مدون نادر غزلوں، بیاض شبلی اور اس سے نودریافت غیر مطبوعہ کلام شبلی کا تعارف اور اس کی تفصیلات قلم بند کی گئی ہیں۔ علامہ کی تقریظ نگاری اور تلخیصات شعر العجم

کی تعارفی تفصیلات سے مطالعہ شبلی کا نیا عنوان سامنے لایا گیا ہے "یادرفتگاں" اور "مولانا ابوالجلال ندوی، دیدہ وشنیدہ" میں مذکور احوال وافکار شبلی کا مطالعہ اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ اس میں شبلی کی شخصیت کے متعلق بعض ایسی معلومات آگئی ہیں جو حیات شبلی میں نہیں ہیں۔

پانچویں حصے کے بارہ مقالات میں پہلا مقالہ "بیان شبلی" کے عنوان سے ہے جس میں سیرۃ الفاروق یعنی خلاصہ الفاروق، خلاصہ بے نظیر، خلاصہ حیات شبلی وغیرہ کے متعلق تفصیلات ہیں۔ دوسرا نوادرات شبلی کے نام سے ہے۔ اس میں دین سے ناواقف مسلمانوں کی مردم شماری سے متعلق ایک نادر مکتوب، ایک نادر غزل، ایک مقطع وغیرہ کا ذکر ہے۔ تیسرا علامہ شبلی کی نصابی کتابوں "تاریخ بدء الاسلام"، "نصاب فارسی"، "انٹرنس کورس فارسی" وغیرہ کے باب میں ہے۔ چوتھا مولوی عبد الحافظ باعظہ، مولوی عبدالحق، حکیم محمد اسحاق اور سید عبداللہ وغیرہ کی تحریروں اور خودنوشتوں میں ذکر شبلی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ایک مقالے میں علامہ شبلی کے نام معنون کتابوں "البرامکہ"، "تذکار سلف"، "عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ" وغیرہ کی دلچسپ تفصیل فراہم کی گئی ہے۔ ایک مقالے میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین سے مولانا شبلی کے ادارتی اور مزید دو مقالے منشورہ دکن ریویو اور پنجاب ریویو کے ذریعے شبلی کے صحافتی وعلمی تعلق کو واضح کیا گیا ہے۔ "علامہ شبلی کا روزنامچہ" سے شبلی کے مزید سوانحی حالات کا علم ہوتا ہے۔ "علامہ شبلی اور حرمین" کے عنوان سے مقالے میں شبلی کے سفرحج، انجمن خدام کعبہ کی رکنیت، مکہ اور مدینہ یونیورسٹی کے سلسلے میں شبلی کی خدمات کی اصل نوعیت معلوم ہوتی ہے۔ ایک مضمون میں ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی کی شبلی شناسی اور صاحب کتاب کی شبلیات سے متعلق کتابوں کا منظوم تعارف بھی پڑھنے کے قابل ہے۔

چھٹے حصے میں دس مقالات ہیں۔ پہلے مقالے کا آغاز اس دعائے شبلی سے ہوا ہے جو انہوں نے ندوۃ العلماء کی اولین عمارت کی تعمیر میں طلبہ کے ساتھ مل کر مانگی تھی۔ دوسرے مقالے میں ندوہ سے متعلق نظام حیدرآباد دکن سے ایک درخواست، چار نادر مکتوبات اور "انجمن ترقی اردو کا پہلا دستورالعمل" کے نام سے شبلی کی ایک بیش قیمت تحریر شامل ہے۔ ایک مقالے میں علامہ شبلی کے بچپن کے بیس احباب احمد اللہ وکیل، احمد علی، حافظ حبیب اللہ اور منشی حسن

رضا وغیرہ کے احوال، مکاتیب شبلی اور دوسرے حوالوں سے نقل کیے گئے ہیں۔ایک مقالہ "علامہ شبلی اور کشمیر" کے نام سے ہے جس میں بعض نئی معلومات موجود ہیں۔ایک مقالے میں وفات شبلی پر لکھے جانے والے قطعات تاریخ اور لوح مزار اکٹھا کیے گئے ہیں: "جامعات میں مطالعہ شبلی" اپنے موضوع پر پہلا مقالہ ہے جس میں ہند وبیرون ہند میں شبلی پر ڈاکٹریٹ اور ایم فل کے کل ۹۶ مقالات کی فہرست درج کی گئی ہے۔آخر میں شبلی شناسی کے اولین نقوش میں شمار کیا جانے والا عبداللطیف اعظمی کا مشہور ومفید مقالہ "شبلی کے معتقد ومنتقد" شامل کرکے اس کی دستیابی آسان بنادی گئی ہے۔

ساتویں حصے میں نو مقالات ہیں۔سابقہ حصوں میں بیان شبلی، نوادرات شبلی اور سخنوران شبلی کے تحت شبلیات کا مطالعہ کیا گیا تھا۔حصہ ہفتم میں ان کے علاوہ تین نئے مطالعات کو شامل کیا گیا ہے۔پہلے مقالے میں شبلی کی علمی وملی خدمات ملکی انجمنوں کے حوالے سے، دوسرے میں شبلی کی نگاہ میں ہندوستان کے چند علمی وتعلیمی ادارے اور کتب خانے اور ایک مقالے میں شبلی کی تاریخ التاریخ کی تدوین وتصنیف کے منصوبے کی تفصیلات، کتب ورسائل سے تلاش کرکے یکجا کی گئی ہیں۔یہ مقالات شبلی کی نادر تحریروں کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔ایک مقالے میں شعرالعجم اور رسالہ الندوہ لکھنؤ پر محمد یعقوب اور سر شیخ عبدالقادر کا مختصر مگر ناقابل فراموش تبصرہ شامل ہے۔ایک مقالہ "شبلیاتی ادب کا اشاریہ" کے نام سے ہے جس میں کتابیات شبلی کی اشاعت کے بعد شبلی پر جو کام ہوئے ہیں ان کا احاطہ کیا گیا ہے۔

مجموعی لحاظ سے "بیان شبلی" کے یہ مجموعے ذخیرۂ شبلیات میں اضافہ، فکر شبلی کی فہم وتفہیم، ترسیل وابلاغ اور شخصیت شبلی کی یافت ودریافت میں بے حد ممد ومعاون اور علامہ کی علمی خدمات کے ساتھ ساتھ ان پر کیے گئے بہت سے ان کاموں اور پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں جو عام دسترس میں نہیں تھے۔شبلی کی سیرۃ النبی کی سات جلدیں طبع ہوئیں اور یہ حسن اتفاق ہے کہ سیرت نگار وعاشق رسولؐ "شبلی" کے تعلیمی، علمی، ادبی، صحافتی، تحقیقی کمالات اور ملی، ملکی اور قومی خدمات پر مقالات کی اشاعت کا جو سلسلہ "بیان شبلی" کے نام سے شیدائے شبلی ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے شروع کیا تھا اس کا اختتام بھی اس ساتویں حصے پر ہورہا ہے۔ساتوں حصوں کے کل مقالات کی

تعداد ۲۷ ہے۔ ہر حصے کو پرکشش، متنوع معلومات، نادر مکتوبات اور تحریروں پر مشتمل اور دستاویزی حیثیت کا حامل بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہر حصے میں شبلی کی علمی و سوانحی زندگی کو کسی نئے نقطۂ نظر سے دیکھا گیا ہے۔ قدیم و جدید رسائل و جرائد میں مطبوعہ بیشتر تحریروں کی تلاش و تفحص میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی ہے۔ دیباچوں میں ان کی حصولیابی کی دیانت دارانہ تفصیل، اس کی پہلی، دوبارہ یاسہ بارہ اشاعت اور زیر نظر مجموعے میں ان کی معقول وجہ شمولیت تحریر کی ہے۔ متعدد موضوعات، عنوانات، بیانات اور ذیلی سرخیوں میں بہ ظاہر یکسانیت اور تکرار نظر آئے گی لیکن جب اس میں پیش کردہ مواد و معلومات اور ڈاکٹر صاحب کے استنباطات و نتائج کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو واضح طور پر اس کی جدت و انفرادیت کا علم ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی دبستان شبلی کے ممتاز نمائندوں میں ہیں جس کی سب سے اہم خوبی ایجاز و جامعیت، زبان و بیان کی سلاست و روانی اور تحقیقی استناد ہے۔ اس پورے سلسلے میں یہ اوصاف ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی اکثر تصنیفات کسی مشہور و معروف صاحب قلم کی تقریظ و دیباچے سے مزین ہوتی ہیں لیکن حصہ (۲) کو چھوڑ کر دوسرے حصے ان سے خالی ہیں۔ اس خلا کی تکمیل ڈاکٹر صاحب نے ہر حصے کے بیک کور پر کسی نامور مصنّف و محقق کے ان تاثرات کو بلرب کے طور پر شائع کیا ہے جو ان کی کسی کتاب پر پہلے لکھے گئے تھے۔ اس سے ان علماء و مصنّفین کی نگاہ میں ڈاکٹر صاحب کی علمی و ادبی قدر و منزلت اور ان کی تصنیفات کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ بیان شبلی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ کسی نہ کسی ادیب یا اہل علم کے نام معنون اور اشاریہ و کتابیات سے آراستہ ہے۔

"بیان شبلی" میں وارد متعدد موضوعات پر ڈاکٹر صاحب نے پہلے بھی لکھا ہے۔ ان مجموعوں کے ذریعہ انھوں نے شبلی پر کیے گئے اپنے علمی و تحقیقی کاموں میں اضافہ کیا ہے۔ ایسی علمی و تحقیقی سربلندی کم ہی مصنّفین کے حصے میں آئی ہے۔ اس کو ان کی انفرادیت بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ آثار شبلی کو ایک صاحب علم نے شبلی پر "انسائیکلوپیڈیا" کہا ہے۔ شبلی صدی کے بعد "بیان شبلی" کی شکل میں شبلی کی ان نئی دریافتوں کو "دائرۂ معارف شبلی" سے تعبیر کرنا نامناسب نہ ہو گا۔

تبصرۂ کتب

علامہ ثناء اللہ امرتسری، تغلیب الاسلام بر تہذیب الاسلام: پیش کش ڈاکٹر بہاء الدین محمد سلیمان، صفحات ۳۶۷، الدار الاثریہ، نئی دہلی، ۲۰۲۴ء، قیمت: ۵۰۰ روپے۔

متحدہ پنجاب کے ایک دینی خانوادے کا چشم و چراغ عبدالغفور بابو بی اے آریہ سماج کی تعلیمات سے متأثر ہو کر اسلام سے پھر گیا اور ہندو مذہب قبول کرکے "دھرم پال" بن گیا، پھر اسلامی عقائد و اعمال کی تردید و تغلیط پر متعدد کتابیں ترک اسلام، نخل اسلام اور تہذیب الاسلام لکھیں۔ ان کتابوں کے علمائے اسلام کی طرف سے درجنوں جوابات بھی دیے گئے لیکن ان تصنیفات کا سب سے مؤثر، مدلل اور منطقیانہ و محققانہ جواب مشہور مناظر اسلام اور مفسر قرآن مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ نے بالترتیب تُرک اسلام، تبر اسلام اور تغلیب الاسلام کے نام سے لکھ کر دیا۔ ان کے مخلصانہ جواب کا نتیجہ تھا کہ دھرم پال نے صدق دل سے توبہ کی اور ردائے اسلام پھر سے اوڑھ کر غازی محمود بنے اور اپنی کتابیں نذر آتش کر دیں۔ مولانا امرتسریؒ کی ترک اسلام اور تبر اسلام تو متعدد بار شائع ہوئیں لیکن تہذیب الاسلام کا جواب تغلیب الاسلام، جو چار جلدوں میں تھی، اس کے بعد پھر نہیں شائع ہوئی۔ جلد اول تا سوم ۱۹۰۵ء اور جلد چہارم ۱۹۰۶ء میں مطبع اہل حدیث، امرتسر سے پہلی بار شائع ہوئی تھی اب ڈاکٹر بہاء الدین محمد سلیمان نے عام استفادے کے مقصد سے اس کو ایک ہی ساتھ ایک ہی جلد میں زیور طبع سے آراستہ کرایا ہے۔

ان چاروں جلدوں کی ہر جلد میں پہلے چند صفحات پر مشتمل دیباچے ہیں۔ اس کے بعد ہر چہار جلد میں قرآنیات پر کل اکیاسی اعتراضات کا دندان شکن جواب دیا گیا ہے۔ پہلی جلد میں مکر، کید، استہزاء، لفظ کن، روح اللہ، کرسی و عرش، بعض آیات اور سورتوں نساء، توبہ، فاطر وغیرہ۔ دوسری میں سجدۂ آدم، طوفان نوح، شجر ممنوعہ، آسمان، اعمال کا وزن، بروز قیامت سورج، چاند اور سیاروں کے حال وغیرہ۔ تیسری میں بروز قیامت اعضاء کا کلام کرنا، جنت کی دائمی لذت، حور و غلمان

جنت، حالت احرام میں مکہ میں شکار کی ممانعت، کعبہ، معجزات کے انکار وغیرہ اور چوتھی جلد میں سلیمانؑ کے حکم سے ہواؤں کا چلنے، شہد کی مکھیوں کو الہام، صالحؑ کی اونٹنی، من وسلوی، بنی اسرائیل، عزیرؑ کی دوبارہ زندگی اور یاجوج وماجوج وغیرہ جیسے قرآنی موضوعات ومسائل پر اعتراضات زیر بحث آئے ہیں۔

مولانا امرتسریؒ کے جواب دینے کا اسلوب مناظرانہ کے ساتھ ساتھ علمی وتحقیقی بھی ہے۔ عربی الفاظ کے صحیح معنی ومفہوم کو نہ سمجھ پانے کی وجہ سے بھی معترضین اعتراض کر بیٹھتے ہیں۔ مولانا نے لغوی تحقیق کر کے ایسے اعتراضات کی قلعی کھولی اور خود آریوں کی مذہبی کتابوں سے ان کے خلاف دلائل اور تضادات پیش کیے ہیں۔ زیر نظر ہندوستانی ایڈیشن میں اغلاط کی تصحیح، حوالوں کی تحقیق ومراجعت، ہر اعتراض کا الگ صفحے سے آغاز اور ہندی اور سنسکرت الفاظ بھی لکھ دیے گئے ہیں۔ ایسی مفید وبامقصد کتاب کا مطالعہ ان لوگوں کے لیے ضروری ہے جو قرآنیات پر معاندین اسلام کے اعتراضات کا آج کے حالات میں مسکت جواب دینا چاہتے ہیں۔ اس اہم تصنیف کی تخریج وتصحیح کے فرائض کی بہ حسن وخوبی انجام دہی کے لیے مرتب لائق تحسین ہیں۔ (کلیم صفات اصلاحی)

ڈاکٹر عبدالرحمن ساجدالاعظمی، حیات شیخ الاسلام، امتیازات وخصوصیات، صفحات ۲۷۲، مدرسہ اسلامیہ سردارالعلوم، مرادآباد، ۲۰۲۴ء، قیمت: ۲۷۰روپے، موبائل: ۹۰۵۸۰۵۵۶۰۰۔

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی علم وعمل، زہد وورع، سلوک وتصوف میں ممتاز، نمونۂ سلف اور اسلام کی مجسم تصویر تھے۔ ان کی شخصیت ”آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری“ کا مصداق تھی۔ ملک وملت کے لیے انہوں نے ناقابل فراموش قربانیاں دیں۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے ساتھ مالٹا میں قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ ”اسیر مالٹا“ ان کے نام کا جزء ہو گیا۔ وہ علم ظاہر وباطن میں مولانا اشرف علی تھانوی کے ہم پایہ تھے لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ ایک نے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر علمی ودینی خدمات انجام دیں اور دوسرا مسند درس حدیث کو زینت بخشنے کے ساتھ سیاسی میدان میں بھی شمشیر بکف نہ سہی تو کم از کم سر بکف ضرور تھا۔

فاضل مؤلف سے شیخ الاسلام کی سوانح ”مآثر شیخ الاسلام“ پر مقالہ لکھنے کی فرمائش کی گئی تو

مولانا حسین احمد مدنی کی زندگی کے نشیب وفراز، ان کے دینی و سیاسی افکار و نظریات، ان کے اسفار، جیلوں میں گذارے ہوئے لمحات، گرفتاری و مقدمات، شیخ الاسلام کی جدوجہد آزادی کے ثمرات، جمعیۃ العلماء کا قیام اور اس کا متحدہ محاذ، انسداد فسادات کی فکر اور دینی تعلیم کے فروغ کے لیے عملی کوششوں کی داستان کو ایک مقالے میں سمیٹ پانا مشکل ہوگیا۔ اس پر مستزاد مولانا کے محاسن اخلاق، تواضع وخاکساری، خدمت خلق، مہمان نوازی، استغناو توکل، حق گوئی، صبر واستقامت، عفوودرگذر، شفقت وعزیمت ، ردبدعت اور اس کے لیے اصلاحی کاوشوں پر مشتمل واقعات اور شیخ الاسلام کے امتیازات کے متعلق مستند علما کے تاثرات کے استقصاء سے یہ مقالہ اس قدر طویل ہوگیا کہ ایک کتاب کی شکل اختیار کرگیا۔ اب یہ گویا مآثر شیخ الاسلام کی نئے اسلوب وانداز سے ان لوگوں کے لیے مفید تلخیص تیار ہوگئی ہے جن کے پاس مطالعے کے لیے وقت کم ہے۔ البتہ آخر میں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے متعلق شیخ الاسلام کے نظریات پڑھ کر اس انکشاف سے حیرانی ہوئی کہ وہ ”دوسرے مذہبی فرقوں کے مقابلے میں اس جدید فرقہ کو دینی اور مذہبی تباہیوں اور ہلاکتوں کو زیادہ تباہ کن اور مہلک تصور فرماتے ہوئے اس فرقے کے خلاف اعلان جہاد فرمایا“ (ص ۲۵۹)۔ مؤلف نے اس ضمن میں جو توسع دکھایا ہے وہ قابل ذکر ہے یعنی ”اگر جماعت کا دستوری عقیدہ آپ کا نہیں ہے اور آپ محض ایک اسلامی تنظیم کی حیثیت سے دین کی خدمت، علم کی نشرواشاعت، اور ملت کی سربلندی کے لیے متحرک اور فعال ہیں تو آپ کی خدمات قابل تحسین ہیں، ورنہ فساد عقیدہ کے ہوتے ہوئے کچھ قابل قبول نہیں“ (۲۶۳)۔ (ک۔ص اصلاحی)

محمد عارف اصلاحی، ہمارے حضور ﷺ: صفحات ۲۰۸، البدر بک سینٹر، سرائمیر، اعظم گڑھ، سن اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۱۶۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۸۳۹۵۹۱۴۳۴۔

بچوں کے لیے سیرت پر اب تک جو کتابیں لکھی گئیں ان میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ”رحمت عالم“ کو جو حسن قبول حاصل ہوا، اس کا اب تک کوئی جواب نہیں ہو سکا ہے۔ اس کے درجنوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن آیا ہی تھا کہ متعدد زبانوں جیسے ہندی، گجراتی

اور بنگالی میں اس کے ترجمے ہوئے اور دکن، پنجاب، یوپی اور بہار کے اسلامی مدرسوں اور مکتبوں میں داخل نصاب ہوئی۔ اس کے بعد رہبر کاملؐ، ہمارے رسول پاکؐ، ہمارے رسولؐ، ننھے رسولؐ، نور محمدیؐ وغیرہ جیسی درجنوں کتابیں لکھی گئیں اور وجود پاکؐ سے عام مسلمانوں اور طالب علموں کا رشتہ جوڑنے میں کامیاب ہوئیں۔ زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہے۔

مؤلف نے دوران تالیف، سیرت کی درجنوں کتابیں سامنے رکھی تھیں لیکن بنیاد سیرۃ النبی اور الرحیق المختوم کو بنایا گیا ہے۔ مصنّف اس سے پہلے "سچی کہانیاں" کے نام سے بچوں کے لیے ایک سیریز تیار کر چکے ہیں جو عوام بالخصوص طلبہ وطالبات میں مقبول ہوئی۔

اس کتاب میں انہوں نے اپنے مجوزہ خاکے کے مطابق رسول اللہؐ کی پیدائش سے وفات تک کے منتخب واقعات کہانیوں کے انداز میں مختصراً نقل کیے ہیں۔ سیرت کا موضوع اس قدر طویل ہے کہ واقعات سیرت کا سو دو سو صفحات میں استقصاء ممکن نہیں، لیکن ارکان اسلام توحید، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ اور حضرت خدیجہؓ کے علاوہ دوسری امہات المؤمنین کا ذکر اگر نہ آسکا ہو تو یہ یقیناً سیرت کی کمی ہوگی اور کتاب کی جامعیت پر حرف آئے گا۔ واقعات کے الگ الگ جلی عناوین قائم کرکے ہر عنوان کے تحت سوالات اس مقصد سے قائم کیے گئے ہیں کہ ان کے جوابات طالب علم تلاش کرے اور واقعات اس کے ذہن میں محفوظ ہو جائیں۔ اس پر زیادہ زور دیا گیا ہے کہ جو واقعہ بھی لکھا یا بیان کیا جائے اس کا اسلوب ایسا دلکش اور عام فہم ہو کہ ذہن نشین ہو جائے اور اس مقصد میں وہ بلاشبہ کامیاب ہیں۔ مؤلف بچوں کی ذہنی سطح سے بخوبی واقف ہیں، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کتاب میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے آسان اور سہل الفاظ کا انتخاب اور طفلانہ مزاج کی پوری رعایت کی ہے۔ اس کے علاوہ اس فکری غذا کو معصوم ذہنوں میں محفوظ کرنے اور واقعات سیرت سے لطف اندوز ہونے کے لیے جو طرز اداموزوں اور مناسب ہے اس کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ امید یہی ہے کہ اس کو بھی رحمت عالم اور بچوں کے لیے سیرت پر لکھی جانے والی دوسری کتابوں کی طرح قبولیت عام حاصل ہوگی اور یہ کتاب بھی دینی وعصری درس گاہوں کے نصاب میں شامل کی جائے گی۔ (ک۔ ص اصلاحی)

نعتِ پاک

وارث ریاضی
کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج، مغربی چمپارن، بہار، ۸۴۵۴۵۳
موبائل نمبر: ۸۲۲۸۹۰۲۵۴۸

حسیں، دل کشا، شاخسارِ مدینہ
خوشا رونقِ پُر بہارِ مدینہ
فضائے مدینہ فرشتوں کا مسکن
کہ فردوس میں ہے شمارِ مدینہ
نظر میں حسیں سبز گنبد کے منظر
لبوں پر ثنائے نگارِ مدینہ
فضا ہے معطر، سماں گل بہ داماں
ہے رشکِ جناں لالہ زارِ مدینہ
مدینے کی صہبا سے یوں مست ہوں میں
نہیں ٹوٹتا ہے خمارِ مدینہ
فروزاں ہیں ہر سو، نبوت کے جلوے
زہے موسمِ خوشگوارِ مدینہ
صبا تو پیامِ عقیدت لئے جا
جہاں جلوہ زا، کیف زارِ مدینہ
خلوص و وفا، صدق و اخلاص و الفت
ہیں رشد و ہُدا، شاہ کارِ مدینہ
تھکن دل میں محسوس ہوتی نہیں ہے
بڑی جاں فزاں، رہ گزارِ مدینہ
تڑپتا ہے دل اور روتی ہیں آنکھیں
دکھا پھر الٰہی! دیارِ مدینہ
خدا کے لئے اک نظر بھی ادھر ہو
شہِ انبیاء، تاجِ دار مدینہ
یہ اعجاز درسِ نبوت ہے وارث
کہ دنیا ہوئی جاں نثارِ مدینہ

استدراک

اولاد کے باب میں حضرت رقیہؓ کے عنوان سے حضرت مولانا[شبلی]فرماتے ہیں کہ جرجانی نے لکھاہے کہ آنحضرتؐ کی لڑکیوں میں سب سے چھوٹی تھیں، لیکن مشہور روایت یہ ہے کہ حضرت زینبؓ کے بعد ۳۳ قبل نبوت پیدا ہوئیں، ابو لہب کے بیٹے عتبہ سے شادی ہوئی، ابن سعد نے لکھاہے کہ یہ شادی قبل نبوت ہوئی تھی۔ یہ روایت تین ٹکڑوں میں ہے، پہلا ٹکڑا جرجانی کے مطابق حضور پاکؐ کی لڑکیوں میں سب سے چھوٹی تھیں، آخری ٹکڑا ابن سعد کے مطابق ابو لہب کے بیٹے عتبہ سے قبل نبوت شادی ہوئی تھی، روایت کے بیچ کے ٹکڑے کے مطابق مشہور روایت یہ ہے کہ ۳۳ قبل نبوت پیدا ہوئیں۔ اگر یہ مشہور روایت ہے تو زیادہ تر کتابوں میں ہونی چاہئے، مگر تمام تلاش کے باوجود مجھے یہ روایت کسی کتاب میں نہیں ملی اور نہ ہی حضرت مولانا نے اس مشہور روایت کی سند بیان کی۔

انیس احمد، سکریٹری مسلم ریلیف کمیٹی، اعظم گڑھ

مذکورہ بالا عبارت مستفسِر کے ایک لمبے خط کا بنیادی حصہ ہے۔ یہ استفسار عرصہ قبل مستفسر نے مجھے دستی دیا تھا۔ وہ دو تحریروں پر مشتمل تھا۔ ایک حضرت عائشہؓ کی شادی کے وقت ان کی عمر کے بارے میں تھا اور دوسرا سیرۃ النبیؐ میں حضرت رقیہؓ کی شادی کے وقت عمر کے بارے میں۔ پہلی تحریر ہی دیکھ کر مجھے انقباض ہوا اور میں نے دوسری تحریر نہیں دیکھی۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی شادی کے بارے میں اتنی خامہ فرسائی ہو چکی ہے کہ اس پر مزید رائے زنی کرنا عوام تو کیا محققینِ خواص کے لئے بھی ممکن نہیں ہے۔ مزید بر آں اس میں ہماری ایک محترم ترین شخصیت کی توہین نظر آتی ہے۔ پچھلے ماہ مذکورہ مستفسر نے شخصی ملاقات میں اپنی تحریر کے بارے میں استفسار کیا تو میں نے ان کو اپنی رائے بتا دی۔ انہوں نے کہا کہ نہیں، اس کے ساتھ ایک اور تحریر حضرت رقیہؓ کی شادی کے وقت ان کی عمر کے بارے میں تھی جو سیرۃ النبیؐ میں مستقل چھپ رہی ہے جبکہ اس کی کوئی سند نہیں ہے۔ اس کے بعد میں نے دوبارہ ان کی تحریر دیکھی۔ سیرۃ النبیؐ جلد ۲ (موجودہ ایڈیشن (۲۰۲۲ء) کے صفحہ ۳۴۱ پر) میں حضرت رقیہؓ کے بارے میں تحریر ہے کہ ”مشہور روایت ہے کہ حضرت زینبؓ کے بعد ۳۳/ ہجری قبل نبوت پیدا ہوئیں“۔ پرانے ایڈیشنوں میں ”ہجری“ نہیں لکھاہے لیکن بعد میں کسی کم علم پروف ریڈر نے لفظ ”ہجری“ بڑھادیا

جبکہ اس زمانے کی تاریخ یاتو" قبل نبوت "لکھی جاتی ہے یا" قبل ہجرت "۔ دونوں کے ہونے کا کوئی معنی نہیں۔ سیرۃ النبیؐ میں حضرت رقیہؓ کے آپؐ کی سب سے چھوٹی بیٹی ہونے کا حوالہ جرجانی بحوالہ زرقانی (زرقانی ۳/ ۲۳۵) ہے (کتابیات میں شرح الزرقانی علی المواہب اللدنیہ لمحمد بن عبد الباقی، دار الطباعہ مصر، ۱۲۹۱ھ کا ذکر ہے)۔ ان کی پہلی شادی ابولہب کے بیٹے عتبہ سے ہونے کا حوالہ ابن سعد سے ہے جبکہ "۳۳ ہجری قبل نبوت "کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔ درست یہ ہے کہ جب حضرت رقیہؓ کی پیدائش ہوئی تو خود حضور پاکؐ کی عمر ۳۳ سال تھی۔ یہ بات متعدد مآخذ میں درج ہے جیسے:

۔وأما رقية، فولدت سنة ثلاث وثلاثين من مولده صلى الله عليه و سلم (المواهب اللدنیۃ، ۳/ ۲۳۵)۔ (اور رہیں رقیہ تو وہ آپ ﷺ کی پیدائش کے تینتیس سال بعد پیدا ہوئیں)۔

۔قيل كان مولدها سنة ثلاث وثلاثين من مولد النبي (عیون الأثر، ۲/ ۳۷۹)
(کہا گیا کہ ان کی ولادت نبی کی ولادت کے تینتیس سال بعد ہوئی)۔

۔ولدت لرسول الله ﷺ وعمره ثلاث وثلاثون سنة (الصالحي ، سبل الهدي والرشاد فی سيرة خير العباد ،الباب السابع فی مناقب السيدة رقية بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم) (وہ پیدا ہوئیں جب آپؐ کی عمر تینتیس سال تھی)۔

مذکورہ بالا مستند مآخذ کے مطابق حضرت رقیہؓ کی پیدائش کے وقت حضور پاکؐ کی عمر ۳۳ تھی نہ کہ خود حضرت رقیہؓ کی۔ حضرت رقیہؓ کی پیدائش مکہ مکرمہ میں سنہ ۲۰ قبل ہجرت اور سات سال قبل نبوت ہوئی جو عیسوی کیلنڈر کے مطابق سنہ ۶۰۳ء ہے۔

مآخذ:

۔ شرح العلامة الزرقانی علی المواهب اللدنية بالمنح المحمدية للقسطلانی ،محمد بن عبد الباقی الزرقانی، دارالطباعۃ مصر ۱۲۹۱ھ ، ج ۳، ص: ۲۳۵ (یہ دونوں کتابیں الگ ہیں لیکن پرانے دستور کے مطابق دونوں ایک ہی کتاب میں چھپی ہیں۔ قسطلانی کی کتاب میں متن کے درمیان قوسین میں زرقانی کی شرح ہے جس کا حوالہ یہاں دیا گیا ہے)۔

۔ابن سید الناس، عیون الأثر، دار القلم، بیروت، ۱۹۹۳

۔ الصالحي ، سبل الهدي والرشاد فی سيرة خير العباد

ان شاء اللہ سیرۃ النبی کی آئندہ اشاعتوں میں یہ تصحیح کردی جائے گی۔ (ظفر الاسلام خان)

معارف کی ڈاک

علامہ سید سلیمان کا مکتوب

اکتوبر کے شمارہ میں علامہ سید سلیمان کا ایک مفصل مکتوب شائع ہوا ہے، جو ان کے جنوب ہند کے سفر کی روداد ہے اور سید عبدالحکیم دسنوی کے نام لکھا گیا ہے۔ یہ مکتوب معارف ہی میں اپریل ۱۹۵۵ء میں سب سے پہلے شائع ہوا تھا پھر "حیات سلیمان" میں بھی مکمل نقل ہوا، اس کے علاوہ اسی وقت یہ ماہنامہ "ندیم" گیا میں بھی شائع ہو گیا تھا اس لیے بہ ظاہر تکرار اشاعت کی ضرورت نہیں تھی۔

طلحہ نعمت ندوی

معارف: یہ بات بالکل صحیح ہے کہ یہ خط ان کی نشان دہی کے مطابق پہلے شائع ہو چکا ہے۔ یہ خط اصل میں سید ابوالکمال عبدالحکیم دسنوی کے نام خطوط کے مجموعے میں تھا جو دارالمصنفین کے محفوظہ میں رکھا ہوا ہے۔ میں نے معارف میں دینے سے قبل اس کو معارف کی ڈاک کے تحت تلاش کیا۔ جب اس میں نہیں ملا تو اس کو غیر مطبوعہ سمجھ کر میں نے اس کو اشاعت کے لیے بھیج دیا۔ البتہ تلاش کرتے وقت ذہن حیات سلیمان، ندیم گیا اور معارف میں آثار علمیہ و تاریخیہ کے تحت اس کی اشاعت اول کی طرف نہیں جا سکا۔ الانسان مرکب من الخطأ والنسیان۔ لیکن موجودہ قارئین معارف میں جن کے پیش نظر حیات سلیمان کے صفحات اور اس خط کی ستر سال قبل والی اشاعتیں نہیں ہیں ان کے لیے یہ روداد نئی اور یہ تکرار بہت غیر موزوں بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ ایسے بہت سے اہم مضامین اور مکاتیب معارف میں ہیں جن کی آج بھی بہت اہمیت ہے اور لوگ معارف ہی میں ان کی جدید اشاعت کے منتظر ہیں۔ اب تو معارف کے قدیم مقالات و خطوط کے مجموعوں کی باقاعدہ اشاعت کا اہل علم وادب کی طرف سے تقاضا بھی کیا جارہا ہے۔ ہمارے خیال میں جب یہ تمام باتیں سامنے ہوں گی تو ممکن ہے یہ تکرار اشاعت گراں نہ گذرے۔

(کلیم صفات اصلاحی)

رسید کتب موصولہ

شمس الاسلام، اٹھارہ سوستاون (۱۸۵۷ء) کی ان کہی حیرت انگیز داستانیں: انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، صفحات : ۲۰۸، سالِ اشاعت : ۲۰۲۴ء ، قیمت : ۳۰۰ روپے، فون نمبر : ۰۱۱_۲۳۲۳۷۷۲۲

سید شرافت علی ندوی، اقبال کی شاعری میں شخصیات : دارالسادات ، نزد مسجد حمیدی، خانو گاؤں، بھوپال، (ایم پی) صفحات: ۲۸۰، سالِ اشاعت ۲۰۲۵ء، قیمت: ۳۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۸۲۶۰۹۷۴۰۲

مولانا ثناءاللہ امر تسری ڈاکٹر بہاءالدین محمد سلیمان (پیش کش) تاریخ اہل حدیث (جلد نمبر: ۱۶): الدارالاثریہ ، شاہین باغ ، نئی دہلی ، صفحات : ۴۰۰، سالِ اشاعت : ۲۰۲۵ء قیمت : ۶۰۰ روپے ، موبائل نمبر: ۸۰۱۰۶۳۶۳۵۵

اشتیاق سعید، فکر تازہ: نیو میر اپیر اڈائز، میر اروڈ، تھانے، صفحات: ۲۰۰، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۲۶۰روپے، موبائل نمبر: ۹۹۳۰۲۱۱۴۶۱

خورشید احمد اعظمی مدنی، فن اسماء الرجال اور ہندوستانی علماء کی خدمات: مکتبہ احسان، لکھنو ، صفحات: ۱۱۸، سالِ اشاعت، ۲۰۲۵ء، قیمت: ۲۵۰روپے، موبائل نمبر: ۹۷۹۳۱۱۸۲۳۴

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، کلام اسلم ، پاریکھ بک ڈپو، لکھنؤ، صفحات : ۱۲۰، سالِ اشاعت : ۲۰۲۵ء، قیمت: ۲۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۳۸۹۴۵۶۷۸۶

ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا، گیان چند جین کے خطوط مشاہیر ادب کے نام (جلد دوم، سوم)، البلاغ پبلی کیشنز، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی، صفحات : بالترتیب: ۵۴۴، ۵۳۴ سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: بالترتیب: ۷۵۰، ۷۵۰روپے، موبائل نمبر: ۹۹۷۱۴۷۷۶۶۴

مولانا محمد اویس قاسمی، منتخبات و مختارات : قاسمی لائبریری بڑہل گنج، ضلع اعظم گڑھ ، صفحات: ۱۳۶، سال اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۲۰۰روپے، موبائل نمبر: درج نہیں

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی، نصرت الٰہی کی طلب اور اس کے تقاضے: براؤن بکس، اپوزٹ بلائنڈ اسکول، قلعہ روڈ، شمشاد مارکیٹ ، علی گڑھ ، صفحات: ۲۷، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۱۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۸۱۸۸۹۷۹۷۵

عارف عزیز، ڈاکٹر مرضیہ عارف (مرتب)، یہ نصف صدی کا قصّہ ہے: عزیز پبلی کیشنز، گھاٹی بھڑ بھونجہ روڈ، تلیا، بھوپال، صفحات: ۴۴۸، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۱۰۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۴۲۵۶۷۳۰۶۰

تصانیف سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ

اسمائے کتب	قیمت	اسمائے کتب	قیمت
حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ	20/-	ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں	60/-
حضرت ابوالحسن ہجویری	20/-	ظہیر الدین محمد بابر (ہندو مورخین کی نظر میں)	300/-
مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر	70/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (اول)	150/-
محمد علی کی یاد میں	250/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (دوم)	100/-
بزم رفتگاں اول	240/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم رفتگاں دوم	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (اول)	75/-
صوفی امیر خسرو	150/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
اسلام میں مذہبی رواداری	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (دوم)	100/-
بزم تیموریہ اول	400/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم تیموریہ دوم	220/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (سوم)	150/-
بزم تیموریہ سوم	260/-	مغل بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان	
بزم صوفیہ	350/-	سے محبت و شیفتگی کے جذبات	150/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک	240/-	مقالات سلیمان (اول)	400/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام	425/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (اول)	350/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے	250/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (دوم)	150/-
بزم مملوکیہ	250/-	سید سلیمان ندوی کی دینی وعلمی خدمات پر ایک نظر	60/-
ہندوستان کے سلاطین علما اور مشائخ پر ایک نظر	250/-	مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف کا مطالعہ	150/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے		عالم گیر (انگریزی)	100/-
تمدنی کارنامے	200/-	صلیبی جنگ	25/-

Total pages - 84 (Including Title Cover)

DEC 2025 Vol- 212(12) ISSN 0974-7346 Ma'arif(Urdu)-Print

RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP- 43/2023-25

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)

Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی نئی مطبوعات

روایاتِ سیرت نبویؐ (بلاذری کے حوالے سے)	مولانا کلیم صفات اصلاحی	450/-
مصادرِ سیرت نبویؐ (مجموعۂ مقالات سیمینار)	مرتبہ: مولانا کلیم صفات اصلاحی	600/-
عہد اسلامی کا ہندوستان: معاشرت، معیشت اور حکومت کے مسائل	پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	300/-
وفیات مشاہیر (مولانا ضیاء الدین اصلاحی)	ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں وسلیم جاوید	600/-
دارالمصنّفین کے سو سال (اضافہ شدہ)	مولانا کلیم صفات اصلاحی	500/-

تاریخ ساز ادارے کے معاون خاص بنئے

برصغیر کے قدیم ترین علمی اور تحقیقی ادارہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ کو خود کفیل بنائیے۔ سنہ ۱۹۱۴ سے قائم یہ وہی ادارہ ہے جس نے علامہ شبلی نعمانی کی شہرہ آفاق تصنیف سیرت النبی سمیت ۲۸۰ بیش قیمت علمی اور تحقیقی کتابیں شائع کی ہیں۔ آج جبکہ تاریخ کے نام پر مسلمانان ہند پر یلغار ہو رہی ہے، اس ادارے کو تقویت دینا اور خود کفیل بنانا پوری ملت کا فرض ہے۔ کم از کم پانچ ہزار روپیے سالانہ تعاون فرمائیں۔ اکاؤنٹ کی تفصیل اور QR کوڈ حاضر ہے۔

A/C: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH
A/C No: 0504010100032752
Bank Name: PUNJAB NATIONAL BANK
Branch: HEERPATTI - AZAMGARH (U.P.)
IFSC: PUNB 0476100 - Bank Code: 476100

Darul Musannefin Shibli Academy
Shibli Road, Azamgarh-276001, U.P.
Contact: Dr Fakhrul Islam Azmi, Dy. Director
Mobile: 99352 33940
Email: info@shibliacademy.org [to inform after remittance]
www.shibliacademy.org

7309301663m1@pnb
Scan and pay with any BHIM UPI
BHIM UPI
G Pay PhonePe Paytm

تعاون بھیج کر اپنے پورے پتہ کے ساتھ ہمیں ای-میل سے مطلع کریں۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام خان (ڈائرکٹر)